ریاستی دہشت گردی
ناؤم چومسکی

ریاستی دہشت گردی

ناؤم چومسکی

مترجم

عامر اعجاز بٹ

جمہوری پبلیکیشنز

جمہوری شعوری فکری تحریک

اہتمام : فرخ سہیل گوئندی

پروڈکشن مینیجر : محمد امین ملک

ISBN: 969-8455-06-X

نام کتاب : ریاستی دہشت گردی

مصنف : ناؤم چومسکی

مترجم : عامر اعجاز بٹ

اشاعت اول : اپریل 2003ء

سرورق : خالد قریشی

ناشر : جمہوری پبلیکیشنز

پرنٹرز : شناخت پریس، 40۔ایبٹ روڈ، لاہور

قیمت : -/300 روپے

جمہوری پبلیکیشنز

9۔الشجر بلڈنگ، نیلا گنبد، لاہور۔ پی او بکس نمبر 6283۔لاہور کینٹ۔

Ph # 042-7212437. Fax # 042-6670001. E-mail:Jumhoori@hotmail.com

فہرست

ریاستی دہشت گردی 7

مترجم کا نوٹ 11

ابتدائیہ 13

حصہ اول 1986ء کے سکینڈلز

باب 1 چیلنج 23

باب 2 ثقافتی اور تاریخی سیاق وسباق 35

باب 3 خفیہ دہشت گردی کے وسائل 45

باب 4 سکینڈل کی حدود 63

باب 5 دہشت گردی کا کلچر 71

باب 6 نقصان پر قابو 103

باب 7 سفارتی حل کے نقصانات 117

باب 8 حقیقت جسے ذہنوں سے محو کردینا چاہیئے: ایران اور نکاراگوا 153

حصہ دوم ریگن انتظامیہ کی مزید ناکامیاں

باب 9 تباہی کی طرف دوڑ میں تیزی 175

باب 10 دُشمن کے علاقے پر قابو پانا 179

باب 11 آزاد دُنیا میں اظہارِ رائے کی آزادی 183

حصہ سوم امریکہ کا نیا عالمی نظام

باب12	اچھی مثال کا خطرہ	193
باب13	نوخیز جمہورتیں	199
باب14	علاقائی معیار کی بحالی	219
باب15	اپنے لئے معیار کا تعین	223
باب16	امکانات	227
	نوٹس	229

نوٹ: کتاب کے آخر میں تمام نوٹس ابواب کی ترتیب کے حساب سے انگریزی ہی میں دیئے جا رہے ہیں تا کہ قاری کو تحقیق کے سلسلے میں آسانی رہے۔

ریاستی دہشت گردی

ناؤم چومسکی 1928ء میں امریکی ریاست پنسلوینیا کے شہر فلاڈلفیا میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پلے بڑھے۔ انہوں نے پنسلوینیا یونیورسٹی سے لسانیات میں پروفیسر زیلنگ ہیرس کے زیر نگرانی ڈاکٹریٹ کیا اور اسی دوران انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی جونیئر فیلو کی حیثیت سے داخلہ لے لیا۔ 1955ء میں انہوں نے دنیا کی معروف تعلیمی درسگاہ MIT(Massachusetts Institute of Technology) میں فرنچ اور جرمن زبانیں پڑھانا شروع کر دیں اور پھر 1976ء میں وہ MIT ہی میں لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھانے لگے۔

وہ عصری تاریخ میں علم لسانیات میں انقلاب برپا کرنے والے مفکر ہیں۔ 1950ء سے 1957ء تک کا عرصہ انہوں نے لسانیات میں ایک نئی تھیوری پیش کرنے میں صرف کیا، جسے Transformational-Generative تھیوری قرار دیا گیا۔ انہوں نے اس تھیوری (Generative Grammar) کی بنیاد پر یہ خیال پیش کیا کہ تمام انسانی زبانیں ایک ہی بنیاد رکھتی ہیں۔ ان کی اس تھیوری کو علم لسانیات کی دنیا میں ایک انقلابی کارنامہ کہا جاتا ہے اور اس بنیاد پر اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر ناؤم چومسکی اپنے شعبے کے آئن سٹائن ہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔ ان کی تھیوری نے انسانی ارتقاء میں زبانوں کے حوالے سے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ یہ تھیوری پیش کرتے ہیں کہ ہر انسان جس کا کسی بھی زبان سے تعلق ہے اور بات کرنے سے پہلے جو وہ سوچتا ہے اس کی گرامر ایک ہی ہے۔ انہوں نے اس تھیوری کو اپنی کتاب Syntactic Structures میں پیش کر کے علم لسانیات میں ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔

ناؤم چومسکی کا پہلا تعارف ایک Linguist کا ہی ہے۔ گو انہوں نے بہت پہلے سیاسیات، خصوصا عالمی

سیاسیات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ 60ء کی دہائی میں جب امریکہ میں Civil Liberties کی تحریک نے جنم لیا تو اس دوران سیاسیات کے حوالے سے ان کی تحریریں منظر عام پر آنا شروع ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا میں فوجی قوت کے ساتھ وہاں کی عوامی جمہوری تحریکوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔ اس طرح پروفیسر ناؤم چومسکی جنوب مشرقی ایشیا کے حوالے سے امریکہ کے کردار پر ایک بڑے نقاد کے طور پر اُبھر کر سامنے آئے۔ فکری اور عملی حوالے سے میسا چیوسسٹ کو امریکہ کی ترقی پسند ریاست قرار دیا جاتا ہے اور یہاں کے اسکالرز، پروفیسرز، طلبہ، اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے طبقات، امریکہ کے عالمی، عسکری اور استعماری کردار کے بڑے نقاد تھے اور پروفیسر ناؤم چومسکی اس تحریک کے ایک ایکٹویسٹ تھے۔

پروفیسر ناؤم چومسکی ماہر لسانیات ہیں، مگر ان کی عالمی شہرت، عالمی امور پر ایک نقاد کے طور پر ہے اور ان کا بنیادی موضوع امریکہ کا عالمی کردار ہے۔ نظریاتی طور پر وہ ایک Libertarian Socialist ہیں۔ چومسکی ان مفکرین میں شامل نہیں جو اپنی علمی، فکری کوششوں، تحریروں اور تقریروں تک محدود رہتے ہیں۔ بلکہ چومسکی کی پہچان ایک Activist کی بھی ہے۔ وہ اپنے ملک امریکہ کے استعماری کردار کے خلاف نہ صرف قلم اور زبان کے ذریعے حقائق بیان کرتے ہیں بلکہ وہ امریکہ، یورپ، جنوب رقی ایشیاء، افریقہ، لاطینی امریکہ یا جہاں کہیں بھی کسی عوامی تحریک کی طرف سے ان کو دعوت ملے وہ وہاں عملی طور پر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کا یہ کردار پاکستان کے اہل قلم، خصوصاً مفکرین کیلئے ایک رول ماڈل ہونا چاہئے۔

11 ستمبر 2001ء کے بعد دنیا بدل گئی اور اس کے بعد ناؤم چومسکی پاکستان تشریف لائے، اُن کی پاکستان اور بھارت میں کی گئیں تقریروں نے یہاں کے عام آدمی کی توجہ حاصل کر لی اور اب ناؤم چومسکی پاکستان کے عوامی حلقوں میں کوئی اجنبی نام نہیں۔ ان کی تقریروں کو بائیں بازو کے علاوہ دائیں بازو کے مفکرین اور صحافیوں نے بھی بڑا پسند کیا اور ابھی تک اپنی تحریروں میں ان کی تقاریر اور مضامین کا حوالہ دینے کا سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر ناؤم چومسکی دنیا کے اُن مفکرین میں شامل اور تحریکوں سے وابستہ ہیں جنہوں نے افغانستان میں 1980ء سے ہی امریکہ کی طرف سے نام نہاد ''جہاد'' کی مخالفت کی تھی۔ امریکہ کا 1980ء میں اس خطے میں وہی کردار تھا جو آج ہے، فرق صرف چند ایک اتحادی بدلنے کا ہے۔ ہمارے دائیں بازو کے اہل قلم حضرات آج کل جوش و جذبات سے ناؤم چومسکی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ ایک امریکی مفکر بھی امریکہ کے عالمی کردار کا نقاد ہے۔ ناؤم چومسکی یا مغرب کے ایسے لاتعداد دوسرے ترقی پسند مفکرین سرد جنگ کے زمانے سے ہی

امریکہ کے افغانستان اور دوسرے خطوں میں امریکہ کے سیاسی اور عسکری کردار کے نقاد رہے ہیں، دراصل یہ مفکرین یورپ امریکہ اور لاطینی امریکہ کی اُن تحریکوں میں شامل ہیں جو مذہب، رنگ، نسل، قبائل اور دوسری Identities سے بالاتر ہو کر استعمار کے ظلم اور استحصال کی مخالفت کر رہی ہیں اور استعمار بلاامتیاز ان تحریکوں کو کچلنے کے درپے ہے۔

آج امریکہ، لاطینی امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے عوام امریکہ کے عالمی کردار کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے کر کے امریکی حکمرانوں کی پالیسیوں کو مسترد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جنگ کے خلاف بھی ہیں اور نام نہاد Globalization کے بھی۔ دُنیا کی یہ عوامی تحریکیں جن کی قیادت ترقی پسند مفکرین اور رہنما کر رہے ہیں جہاں وہ ایک طرف ریاستی دہشت گردی کو مسترد کر رہے ہیں وہیں پر وہ Economic Terrorism کے بھی مخالف ہیں۔ 1997ء میں جب جنوب مشرقی ایشیا میں عالمی سرمایہ داری نظام نے اقتصادی بحران پیدا کیا تو یہ بحران عسکری دہشت گردی سے کہیں زیادہ المناک سانحہ تھا۔ اس Economic Terrorism نے وہاں کی اقوام کی دو تین دہائیوں کی محنت کو راتوں رات تباہ کرنے کی کوشش کی جو کہ کسی قسم کی فوجی دہشت گردی سے کم نہیں اس اقتصادی دہشت گردی کے زخموں کے نشانات آج بھی جنوب مشرقی ایشیائی اقوام کی معیشتوں پر بدنما داغ ہیں جس کا اثر وہاں کے عام آدمی کی معاشی زندگی پر مرتب ہوا۔ اس لئے آج بڑی اقتصادی طاقتوں کے مسلط کردہ نظام Globalization کیخلاف امریکہ، برازیل، سویڈن، اٹلی، برطانیہ، جرمنی، سپین، آسٹریلیا، بھارت، اور فلپائن کی گلیوں میں عسکری دہشت گردی اور اقتصادی دہشت گردی کے خلاف عوام علم بغاوت بلند کر چکے ہیں یہ جدوجہد دُنیا کو ایٹمی اسلحہ سے پاک کرنے کے خلاف بھی ہے، جو کہ دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور چومسکی اس عالمی جدوجہد کا ایک مفکر اور ایک Activist ہے۔

ناؤم چومسکی نے گزشتہ برس پاکستان میں جو تقریریں کیں اُن کو بڑا پسند کیا گیا۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں ایک بڑی اہم بات کی تھی جو کہ ان کی ساری تقریر کا نچوڑ تھا اور ان کا یہ نقطہ امریکی امپیرلزم کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے انہوں نے کہا تھا کہ

> ''امریکہ کیلئے پرتشدد لوگ خطرہ نہیں ہیں بلکہ امریکہ اِن پرامن لوگوں سے خوفزدہ ہے جو تبدیلی کا فلسفہ بھی رکھتے ہیں۔''

ان کے اس موقف کی حمایت میں یہ دلیل ہی کافی ہے جو کہ میں نے اس سال موسم گرما میں امریکہ میں ایک

کانفرنس میں پیش کی تھی کہ ایسے امریکی دانشور جن میں ناؤم چومسکی اور دیگر مغربی اور امریکی پروفیسر شامل ہیں جو امریکہ کے نقاد ہیں اور یہ مفکرین امریکہ میں کچھ زیادہ متعارف نہیں مگر امریکی ذرائع ابلاغ نے بڑی چابکدستی سے ایسے مفکرین اور امریکی عوام کے درمیان ایک بڑا خلا پیدا کر رکھا ہے۔ جس کے سبب امریکی عوام امریکہ کے دُنیا میں استعماری اور عسکری کردار سے ناواقف ہیں۔ امریکی میڈیا ایک غیر محسوس انداز میں ان مفکرین کو عوام میں متعارف نہ کروانے کے شعوری عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے اس لئے کہ اگر امریکہ جیسے خواندہ معاشرے میں ایسے مفکرین کی آواز پہنچ جائے تو امریکہ میں پر امن انقلاب جنم لے سکتا ہے جو کہ امریکہ کے عالمی کردار کو بدلنے پر مجبور کر دے گا اور ایسا ایک مرتبہ ویتنام کی جنگ میں ہو چکا ہے جب امریکی عوام نے امریکی حکمرانوں کو ویتنام میں جنگ ہارنے پر مجبور کر دیا۔ میرے اس بیان پر کانفرنس کے مقرر سی آئی اے کے سابق پالیسی ساز (مستعفی) بل کرسٹنسن نے مکمل اتفاق کیا۔

لہذا زیر نظر کتاب ریاستی دہشت گردی کے حوالے سے امریکی کردار کو بے نقاب کرتی ہے کہ کس طرح امریکہ اپنی خارجہ پالیسی کیلئے CIA کے ذریعے Covert Actions کرتی ہے تاکہ امریکی خارجہ پالیسی کو Impliment کیا جاسکے۔ سی آئی اے گوئٹے مالا، ایل سلواڈور، چلی، پانامہ، کولمبیا، نکاراگوا، لبنان، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، اور لیبیا سمیت دنیا بھر میں دہشت گردی کے عمل میں مصروف چلی آرہی ہے جو کہ ریاستی دہشت گردی کی ایک بڑی مثال ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ نے جس انداز میں جزیرے پورٹو ریکو پر قبضہ کر رکھا ہے وہ آج کی مہذب دنیا میں ریاستی جبر اور دہشت گردی کی ایک منفرد مثال ہے کہ اس نے اس جزیرے کو جبراً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی Associated State کا درجہ دے کر اس پر قبضہ کیا ہوا ہے اور امریکہ نے وہاں کے عوام پر جو جبر کیا اس کی مغربی دنیا کے سرخیل ذرائع ابلاغ میں کوئی بازگشت سنائی نہیں دیتی کہ وہاں کے لوگوں کو کس طرح فوج میں جبراً بھرتی کر کے ویتنام کی جنگ میں دھکیلا گیا۔ آج پورٹو ریکو کو امریکی بحریہ اور فضائیہ اپنے اسلحے کی تجربہ گاہ کیلئے استعمال کر رہا ہے اور امریکی اسلحے کے ان تجربات کا شکار وہاں کے عام شہری ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہاں پر امریکہ کی عسکریت کے خلاف ایک بھرپور عوامی تحریک موجود ہے جس کی قیادت Mr. Roben Berrios Martirnez کرتے ہیں۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں ریاستی دہشت گردی کی سب سے بڑی مثال خود امریکہ قائم کر رہا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ناؤم چومسکی نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود امریکی حکومتیں کس طرح ان بنیادی اصولوں سے انحراف کر رہی ہیں جو کہ امریکہ کے بانی راہنماؤں نے طے کئے تھے۔

فرخ سہیل گوئندی

دسمبر 2002ء

مترجم کا نوٹ

امریکی حکومت اور اس کے ریاستی اداروں کے دوہرے معیار کا پردہ چاک کرتے ہوئے اور دُنیا کے غریب و محروم عوام پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم اور ریاستی دہشت گردی کے خوفناک احوال پر مبنی زیرِنظر کتاب معروف سکالر پروفیسر ناؤم چومسکی کے مخصوص طرزِ بیان کا ایک شاہکار ہے۔ جس میں مصنف نے ایک طرف تو سی آئی اے، ایف بی آئی، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور دفترِ خارجہ جیسے مضبوط ترین امریکی اداروں کی ملمع سازی پر ضرب کاری لگائی، تو دوسری جانب ایک ایک کر کے وہ ان سب کے بخیے اُدھیڑتے چلے گئے۔ مصنف کی انوکھی و منفرد تراکیبِ زبان کی چاشنی، اندازِ تحریر کی دلکشی اور واقعات کی ترتیب قاری کو مطالعہ میں محو رکھتی ہے۔ کوئی مترجم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا، کہ اُس نے ''چومسکی'' جیسے مصنف کی کتاب کے ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ تاہم ترجمے کے بھرپور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ کاوش آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

عامر اعجاز بٹ
E-mail: aebutt@brain.net.pk

ابتدائیہ

اس کتاب میں شامل مضامین کا مرکزی خیال بنیادی طور پر میری کتاب Turning the Tide میں شامل اضافہ جات پر مبنی تھا۔ آغاز میں میرا ارادہ تھا کہ نئے امریکی ایڈیشن کے لئے اس مواد میں چند تبدیلیاں کر دی جائیں اور اس میں ایران۔ کونٹرا مقدمے کی سماعت تک کے واقعات کو شامل کر دیا جائے لیکن اسی دوران حالات نے جو رخ اختیار کیا اس نے میرے اندر اس موضوع پر ایک علیحدہ اشاعت کی تحریک پیدا کی۔ تاہم میں نے اس کتاب میں اپنی پہلے آنے والی کتابوں Turning the Tide اور On Power and Ideology میں کئے جانے والے مباحث کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں شامل مواد کئی موضوعات پر بحث کرتا ہے۔ ان میں وسطی امریکہ پر ڈھائے جانے والے مظالم، امریکی خارجہ پالیسی کے اصول و مبادی، ان اصولوں کا تیسری دنیا اور خصوصاً وسطی امریکہ میں دخل اندوزی کے وقت استعمال، انہی اصولوں کی روشنی میں قومی سلامتی کے معاملات کا جائزہ، بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات کا جائزہ اور امریکی معاشرے کے چند نمایاں خدوخال شامل ہیں۔ دستاویزی اور تاریخی ریکارڈ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امریکہ کی بین الاقوامی پالیسی کی بنیاد طاقت پر اٹھائی جاتی ہے اور اس کا بنیادی مقصد ''پانچویں آزادی'' کی حفاظت ہے۔ یہ آزادی ڈاکہ زنی، استحصال کمزور پر غالب آنے اور ہر وہ راستہ اختیار کرنے کی آزادی ہے، جو موجودہ مراعات کی حفاظت کرے اور ان میں مزید اضافہ کرے۔ ''پانچویں آزادی'' کا یہ رہنما اصول اس وقت نظر انداز ہو گیا تھا، جب فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے یہ اعلان کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ان چار آزادیوں کو ہمیشہ مقدم جانیں گے

1۔ اظہار کی آزادی 2۔ عبادت کی آزادی

3۔ خواہش کی آزادی 4۔ خوف سے آزادی

امریکی منصوبہ بندی کے بارے میں دستاویزی ریکارڈ اور تاریخ کا بہاؤ ہمیں ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ہم چہار آزادیوں کی اہمیت کا نظریاتی اور عملی طور پر جائزہ لے سکیں اور پانچویں آزادی کے سامنے ان کی بے بسی اور محکومیت کا مظاہرہ دیکھ سکیں۔ یہ پانچویں آزادی امریکی خارجہ پالیسی کا فعال جزو رہی ہے۔ جب بھی یہ محسوس کیا گیا کہ پانچویں آزادی، باقی چہار آزادیوں سے متصادم ہے، توان چار آزادیوں کونظر انداز کر دیا گیا۔

ان پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ریاست فریب اور دھوکا دہی کا ایک جال بنتی ہے۔ نظریاتی اداروں کا تعاون اسے ہمیشہ حاصل رہتا ہے۔ یہ ادارے تاریخی حقائق کی مناسب توجیہات کے لئے وقائع نگاری کا کام نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی رہنماؤں کی طرح تاریخ دانوں اور ماہرین سیاسیات کی یہ ذمہ داری ہے کہ عوام کو دھوکے میں رکھا جائے کیونکہ یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ تھامس بیلی نے، جو کہ ایک اہم تاریخ دان ہے۔ 1948ء میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''عوام عام طور پر ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں اور آنے والے خطرات کا ادراک نہیں کر پاتے۔ ہمارے سیاستدان اس کمزوری کو اپنے وسیع تر مفاد میں استعمال کرتے ہیں۔'' اسی نقطہ نظر کی ہاورڈ یونیورسٹی میں ادارہ برائے بین الاقوامی معاملات کے ڈائریکٹر سموئیل ہنگٹنٹن نے حمایت کی ہے وہ کہتے ہیں ''آپ کو دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور فوجی کاروائیوں کو اس طرح پیش کرنا پڑے گا جس سے یہ احساس اُجاگر ہو کہ یہ لڑائی سوویت یونین کے خلاف ہے۔ نظریہ ٹرومین کی اشاعت کے بعد سے یہ امریکی پالیسی کا اہم جزو رہا ہے۔'' یہ ایک ایسا خیال ہے جو آج کے وسطی امریکہ کے حالات پر صادر آتا ہے۔ علمی حلقوں کی صف بندی بھی اسی خیال کے اردگرد کرنا ہوگی۔ امریکن ہسٹاریکل ایسوسی ایشن (American Historical Association) کی ایک تقریب کے دوران اپنے صدارتی خطاب میں ریڈ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہمیں زندہ رہنے کیلئے جنگجوانہ رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جنگ چاہے سرد ہو یا گرم، ہر ایک کیلئے ایک ذمہ داری متعین کرتی ہے۔ تاریخ دانوں پر ماہر طبیعات سے کم ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔''

اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ عوام بے ضرر رہیں اور ان میں آزاد سوچ کا طریقہ کار پروان نہ چڑھنے پائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ متبادل پالیسیوں کو بہتر انداز سے ترتیب دیا جائے اور اگر نظریاتی ڈھانچے کو کسی چیلنج کا سامنا ہو تو متبادل اداروں کے قیام پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

بعد میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات نے ان خیالات کو سچ ثابت کیا۔ میں اس بات کو ثابت کرنے کیلئے بہت سی مثالیں پیش کروں گا۔ان میں وہ سکینڈلز بھی شامل ہیں جن کا انکشاف 1986ء میں ہوا۔ یہ سکینڈلز ہمارے سیاسی اداروں اوران کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ان میں سے بیشتر کا قبلہ درست نہیں ہے۔ ان کی وجوہات پر میں آگے چل کر بحث کروں گا۔میرازوراس بات پر ہوگا کہ امریکی تاریخ کے اس نازک موڑ پر ہونے والے واقعات سے ہم اپنے اوراپنے علمی ماحول کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

پانچویں آزادی کی طرف ہمارا رحجان کسی نئی سماجی بیماری کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ نہ ہی یہ اس ''سفید ریوڑ'' کی ایجاد ہے جب مغربی یورپ کی طاقتوں نے اپنے گرد عسائیت کا مضبوط قلعہ تعمیر کرتے ہوئے یورپ میں اپنے گھروں کو خیرباد کہا تاکہ لوگوں کا امن وسکون برباد کیا جائے اوردنیا پر قبضہ کرکے لوٹ مار کا بازار گرم کیا جاسکے۔طاقتوروں کا ہمیشہ سے یہی پیشہ رہا ہے جس نے بار بار اپنی شکل تبدیل کی ہے۔مقامی ثقافت نے بزدلی اور عملی بددیانتی کی مثال قائم کرتے ہوئے ہمیشہ اس کی حمایت کی ہے۔یہ روایت ہمیں وراثت میں ملی ہے،لیکن ہم میں کم ازکم اتنی جرات ہونی چاہئے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانک سکیں اوراگر ہمیں کچھ ایسا نظر آئے جس کو ہم ناپسند کرتے ہیں تو ہم پراخلاقی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔

کیمرج میساچیوسسٹ

تعارف

عوام اور ریاستی تشدد

ان لوگوں کے لئے جو امریکی معاشرے کو سمجھنا چاہتے ہیں اور بالخصوص ان لوگوں کیلئے جو اس کے کردار اور بہاؤ کو بدلنا چاہتے ہیں، 1986ء کے سکینڈلز اور اسکے نتائج نہایت سبق آموز ہیں۔ ان سکینڈلز کی وجہ سے منصوبہ سازوں اور نظریہ دانوں کو کم از کم عارضی طور پر پسپائی اختیار کرنا پڑی اور بہت سی دوسری پُرتشدد پالیسیوں کا پول بھی کھل گیا۔

اس پیش رفت نے وسطی امریکہ میں سیاسی تصفیے کے عمل کو بھی تیز کر دیا۔ وسطی امریکہ کے ممالک بہت پہلے اپنے سیاسی مسائل کا حل تلاش کر چکے ہوتے، اگر امریکہ طاقت کے زور پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ اِن ممالک کی کوششیں اگرچہ کسی حد تک بارآور ثابت ہوئیں تاہم یہ مسائل کے مستقل حل کے لئے کوئی وسیع بنیاد مہیا نہ کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مسائل کی جڑ امریکہ کی خطے میں مسلسل مداخلت ہی تھی۔ اگر امریکی عوام کی مزاحمت اور احتجاج، جارحیت کے حامیوں کو طاقت کو استعمال سے روک پائے تو ہمیں ریاستی دہشت گردی کے خلاف کوئی جائے پناہ مل سکتی ہے اور امید کی ایک کرن نظر آتی ہے کہ ہم کچھ تعمیری کوششیں کر کے ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا سکیں گے۔

1986ء کے سکینڈل بہت حد تک ان تحریکوں کا نتیجہ تھے، جو 1960ء کی دہائی میں شروع ہوئیں۔ امریکہ میں کاروباری، سرکاری اور علمی حلقے اپنی حد درجہ کوششوں کے باوجود بھی ان تحریکوں کو ٹھنڈا نہ کر سکے۔

یہ اہم حقیقت شاید کبھی کُتب اور اداریوں کا موضوع نہ بن سکے اور نہ ہی سرکاری تاریخ نویسی میں کوئی جگہ پا سکے۔ اسی طرح جنگ ویت نام کے اسباق کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہاں ضرورت

اس امر کی ہے کہ شہری خود معاملہ فہمی سے کام لیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ جمہوریت کس طرح ریاستی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

جنگِ ویت نام کے دوران عوام کا کردار بالواسطہ ہونے کے باوجود بہت اہم تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کردار انتخابات کے دوران ادا نہیں کیا گیا۔ 1964ء کے انتخابات ویت نام میں جنگ بندی اور فوجوں کے انخلا کے نام پر (واضح برتری سے) جیتے گئے تھے۔ لیکن جیت کے بعد صدر جانسن اور ان کے حواریوں کو جنگی کارروائیوں میں شدّت پیدا کرنے میں کوئی قوّت مانع نہیں تھی۔ جوں جوں ریاستی دہشت گردی اور تشدد میں تیزی آتی گئی عوام میں بے چینی بڑھتی گئی۔ اسی خوف کے تحت حکومت تمام قومی ذرائع کو متحرک کرنے کا اعلان نہ کر سکی جو کہ جنگ جیتنے کے لئے ضروری تھا۔ جانسن کی جنگ اور خوشحالی (Guns & Butter war)* کی پالیسی نے شدید معاشی مسائل کو جنم دیا۔ انہی عوامل نے حکومت کو مجبور کیا کہ جنگ کو محدود رکھا جائے اور 1968ء کے آغاز تک جنگ بند کر دی جائے۔ ان پالیسیوں کے نتائج دور رس تھے نوجوانوں کے درمیان نفرت کے رجحانات کو علمی حلقوں میں تشویش کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ دوسری طرف پینٹا گون نے مطالبہ کیا کہ اگر جنگ کی شدّت میں کوئی نمایاں تیزی لانی ہے تو فوجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ یہاں بنیادی لفظ ''نمایاں'' ہے۔ یہ عوام کا خوف ہی تھا جس کی وجہ سے ساری کارروائی کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔

یہاں جمہوریت کا وہی اصول لاگو ہوتا ہے کہ اگر عوام آنکھیں بند رکھنے سے انکار کر دیں تو انہیں حقیقت سے آشنا ہونے کا موقعہ ہی نہ دیں، کیونکہ یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ فوجوں میں عزم کی کمی اور مورال کی گراوٹ سے یہ سبق ملا کہ ویت نام میں افواج کو بھیجنا غلطی تھی۔ ایسے مواقع پر کرائے کے فوجیوں سے ہی کام چلایا جانا چاہیے تھا جیسا کہ روایت ہے۔ ان مسائل نے معاشی اور سیاسی حلقوں کو ٹاٹ کی لڑائی کے بعد اس بات پر قائل کر دیا کہ جنگ میں شدّت پیدا کیے بغیر برتری کی امید موہوم ہے اور یہ شدّت عوام آسانی سے برداشت نہیں کریں گے۔

یہی وہ عوامل تھے، جنہوں نے 1980ء کی دہائی میں وسطی امریکہ میں مداخلت کا راستہ روکا۔

---

* صدر جانسن کا خیال تھا کہ وہ اپنے دونوں خوابوں، امریکہ کے اندر خوشحال معاشرے کا قیام اور امریکہ سے باہر جنگ میں شرکت اور کامیابی، کو ایک ساتھ پورا کریں گے۔ صدر جانسن کی سیاسی آپ بیتی کے مصنف نے اسے (گنز اینڈ بٹر) پالیسی کا نام دیا ہے۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ صدر جانسن غلطی پر تھے۔ (مترجم)

یہاں عوامی مزاحمت جنگِ ویت نام کے دِنوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اسی وجہ سے ریگن انتظامیہ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کینیڈی اور جانسن کے دور کی براہِ راست دہشت گردی کی پالیسی کو اپنا سکے۔ اگر عوام نے اس دفعہ بھی خاموشی اختیار کی ہوتی تو ریگن انتظامیہ بڑی آسانی سے اپنے جنگی بیڑے کو حرکت دے سکتی تھی جیسا کہ صدر جانسن نے ڈومینیکن ریپبلک میں جمہوریت کے خطرے سے بچنے کے لئے کیا یا جیسا کہ صدر کینیڈی نے ویت نام سے نبٹنے کیلئے اپنی فضائیہ کو بمباری کے لئے بھیجا۔

امریکہ کے حکومتی حلقوں کے لئے یہ بات مایوسی کا باعث بنی کہ عوام (جنہیں یہاں ہم ریاست کے دُشمن ہی کہیں گے) کے دباؤ کی وجہ سے براہ راست مداخلت کا راستہ رک گیا۔ جبکہ بالواسطہ مداخلت اپنے ساتھ بے شمار ناگزیر مسائل کو جنم دیتی ہے۔ یہ طریقہ براہِ راست تشدد کے مقابلے میں کم قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ مزید برآں قومی اداروں کی فرض شناسی کے باوجود راز کے افشاء ہونے کا ڈر ہوتا ہے اور راز کا افشاء ہونا ان بلند و بانگ دعووں کی قلعی کھول دیتا ہے جو عوام کو رام کرنے کیلئے کئے جاتے ہیں۔

دہشت گردی کے خلاف منافقانہ نعروں کو دنیا کے بہت سے لیڈروں نے استعمال کیا تاہم ایران کے خلاف ان نعروں کا جواز ڈھونڈنا ذرا مشکل ہوگا۔

1980ء کی دہائی میں ریاستی دہشت گردی کا پسِ منظر میں چلے جانے کی ایک اہم وجہ عوامی دباؤ ہی تھا۔ 1986ء کے سکینڈلز اپنے ساتھ نئے مسائل بھی لائے، اس سلسلے میں حالیہ پیش رفت اور اس کے پس منظر پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ لیکن یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ بنیادی نتیجہ تفصیلات کی افراتفری میں گم نہ ہو جائے۔

ان واقعات سے سب سے اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امریکہ جیسے غیر سیاسی معاشرے میں بھی، جہاں سیاسی جماعتوں اور اخبارات پر بھی کاروباری معاملات ہی غالب رہتے ہیں، عوامی دباؤ قومی پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہ ویت نام کی جنگ کا ایک اہم نتیجہ تھا۔ وسطی امریکہ کے تجربے نے 1980ء کی دہائی میں اسے ایک بار پھر ثابت کیا اور اسے ہم مستقبل میں بھی نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

حصہ اول

1986ء کے سکینڈلز

باب 1

چیلنج

1986ء کے موسم سرما کے دوران منظر عام پر آنے والے سکینڈلز اور انکے خلاف ردِعمل امریکہ کے سیاسی نظام اور علمی ماحول پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ امریکہ خود جنگل کے قانون کا سب سے بڑا حامی ہے اور اس امریکی پالیسی کو اندرونی حلقوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ہم اگلے صفحات میں اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ مزید برآں، تشدد اور لاقانونیت کا استعمال پالیسی سازوں کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہے، جسے گمراہ کن نعروں کے غلاف میں چھپایا نہیں جاسکتا۔ اگر ہم حقائق کا ایمانداری سے جائزہ لیں تو یہ نتائج فوری طور پر اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ یہ واقعات اور ان کے نتائج ہماری قومی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑیں گے۔

وسطی امریکہ کے حوالے سے ان واقعات نے علمی حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسے نظریاتی نظام کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی جو نہ صرف ان واقعات کی وجہ سے ہونے والے نقصان پر قابو پائے بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنائے کہ ہر نیا واقعہ اسی نظام کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اسی نظریاتی نظام کی روشنی میں 1986ء کے واقعات کی ایک نئی توجیہہ پیش کی جائے اور اس کے لئے عوامی حمایت حاصل کی جائے۔ اس کے علاوہ اس بات کا انتظام کیا جائے کہ مستقبل میں حکومتی اقدامات کسی عوامی ردِعمل یا رکاوٹ کے بغیر جاری رہ سکیں۔

اس نظریاتی نظام کی ضرورت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب عالمی عدالت نے نکاراگوا پر حملے اور باغیوں کی امداد پر امریکہ کی مذمت کی۔ امریکی حکومت کا خیال تھا کہ طاقت کا استعمال ہی وہ واحد راستہ ہے جس سے سینڈینسٹا کو مذاکرات پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ حملے نکاراگوا کی طرف سے کونٹا ڈورا* معاہدے کی منظوری سے صرف پانچ دن بعد کیے گئے۔ امریکہ اور اسکے حلیف ممالک اس معاہدے کو پہلے ہی مسترد کر چکے تھے۔[1] نکاراگوا کی طرف سے معاہدے کی منظوری کو امریکی حکام نے اعلان جنگ سے تعبیر کیا۔[2]

ذرائع ابلاغ اور علمی حلقے حکومت کے اس بنیادی نظریے کو بڑی حد تک تسلیم کر چکے تھے لیکن نکاراگوا کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد اس نظریے پر نئے جوش و جذبے سے کام شروع کیا گیا۔ اخبارات اور نشریاتی اداروں نے نکاراگوا کو یک جماعتی ڈکٹیٹرشپ قرار دیا جو کہ ظلم اور بنیادی حقوق کی پامالی کی مرتکب ٹھہری ہے جبکہ وہ مزاحمت جس نے سابقہ ڈکٹیٹر سوموزہ[3] کا بہادری اور جوانمردی سے مقابلہ کیا اب آزادی اور جمہوریت کے لئے اور ٹیگا کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ایل سیلواڈور میں موجود دہشت گرد حکومت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اسکے بارے میں یہ رویہ اپنایا گیا کہ ایل سیلواڈور، گوئٹے مالا اور ہنڈرس کی طرح ایک 'نوخیز جمہوریت' ہے، جو کہ چہار آزادیوں (Four Freedoms)* کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

تاریخ سازی کے اس عمل کو 1987ء کے اوائل میں نئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا جب باغی فوج کے لٹیروں نے، جو اپنے آپ کو 'ریگن کے بیٹے' کہلاتے تھے، قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ نہتے

---

* میکسیکو، وینزویلا، کولمبیا اور پانامہ کو کونٹاڈورا ممالک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ممالک نے نکاراگوا، ایل سیلواڈور، ہنڈرس، گوئٹے مالا اور کوسٹاریکا کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کیا۔ نکاراگوا نے معاہدے کی شرائط مان کر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لئے پریشانی پیدا کر دی۔ یہ معاہدہ لاطینی امریکہ کے ممالک سے بیرونی فوجوں کی واپسی کی بات کرتا ہے۔

* یہاں صدر فرینکلن ڈی روزولٹ کی اس تقریر کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے 6 جنوری 1942ء کو کانگریس میں کی۔ صدر روزولٹ نے اس تقریر کے آخر میں نوعِ انسانی کے لئے چہار آزادیوں کی طرف اشارہ کیا۔ جوان کے خیال میں مستقبل کے عالمی معاشرے کی بنیاد بنیں گی۔

۱۔ اظہار رائے کی آزادی

۲۔ مذہبی آزادی

۳۔ خواہش کی آزادی جس کا مطلب ہے کہ حکومت کسی شخص کو اپنے خاندان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے سے نہیں روکے گی۔

۴۔ خوف سے آزادی جس کا مطلب ہے کہ تخفیف اسلحہ کی وہ سطح حاصل کی جائے کہ دنیا میں کوئی ملک اپنے ہمسایہ ملک پر جارحیت کا خیال بھی ذہن میں نہ لا سکے۔ (مترجم)

دیہاتیوں پر ظلم و دہشت گردی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے لیکن اسکے باوجود عسکری محاذ پر کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کی جاسکی۔ دوسری طرف سکینڈلز سے پھیلنے والی افراتفری نے امریکی حلیفوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، یہاں سب سے قابلِ ذکر مثال کوسٹاریکا کی ہے جس نے امریکہ کے غم و غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جمہوریت کی راہ لی۔

1987ء میں وسطی امریکہ کے ممالک نے کونٹاڈورا ممالک کی معاونت سے اپنے سیاسی مسائل کے حل کی کوششیں تیز کردیں۔ ریگن انتظامیہ نے پوری کوشش کی کہ وسطی امریکہ کے ممالک کسی پُرامن سیاسی تصفیے پر نہ پہنچ سکیں۔ امن کے لئے کوسٹاریکا کے صدر اریس کی کوششیں امریکہ کے لئے ناقابلِ قبول تھیں، اسکا مطلب ان حدود سے تجاوز تھا جو امریکہ نے قائم کررکھی تھیں۔ اس جرم کی سزا کے طور پر مارچ 1987ء میں کوسٹاریکا کی لاغر معیشت کے لئے امریکی امداد معطل کردی گئی۔ حکومتی دباؤ کے پیشِ نظر امریکی بنکوں نے امداد سے ہاتھ کھینچ لئے۔ دوسرے ممالک سے قرضوں کے حصول کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ کوسٹاریکا کے مال کی درآمد پر پابندی عائد کردی گئی اور امریکہ کے سیاسی دباؤ کی بناء پر صدر اریس کے ایک مشیر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا جو سرکاری ذرائع کے مطابق مجوزہ امن معاہدے کا روحِ رواں تھا۔ ان ہتھکنڈوں کے استعمال سے کوسٹاریکا کو نکاراگوا میں سینڈینسٹا حکومت کے خلاف جہاد میں شامل کیا گیا۔ سین جوزے میں دو اخباری نمائندوں نے اپنے مشاہدے کو اس طرح پیش کیا: ''خطے میں امریکی امداد دو سوملین ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی ہے لیکن امن کی کوششوں کے آغاز سے کوسٹاریکا کے حصے میں ایک پائی بھی نہیں آئی۔'' کونسل آن ہیمیسفیرک افیئرز (Council on Hemispheric Affairs - COHA'S) کی ایک رپورٹ کچھ یوں ہے: ''کوسٹاریکا کے سرکاری ذرائع کے مطابق ریگن انتظامیہ کی جانب سے سفیر مقرر کرنے میں 7 ماہ کا تعطل اس امر کی نشاندہی ہے کہ امریکہ، صدر اریس سے ناخوش ہے۔ اریس کے ایک مشیر کے مطابق امریکی سفارت خانے کا مقصد حکومت سے مذاکرات یا کوسٹاریکا میں سیاسی پیش رفت کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ صرف نکاراگوا کے خلاف لڑنے والے باغیوں کی امداد کے لئے کام کررہا ہے۔''[4]

اِن موضوعات کو اہمیت کے باوجود نظرانداز کیا گیا۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ اصول اخذ کیا گیا کہ اہلِ الرائے اور صاحب عقل افراد کے لئے ریاست ہی بحث کے موضوعات کا تعین کرتی ہے، اس دائرہ

کار میں رہتے ہوئے اظہار خیال کی اجازت ہے اور ان حدود سے تجاوز جائز نہیں ہے۔ یہ بھی فیصلہ کر
گیا کہ اگر عوام اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کا تہیہ کر لیں، تو یہ ضروری ہے کہ دھوکا دہی سے کام لیتے
ہوئے ان کے سامنے جھوٹ ہی پیش کیا جائے۔

امریکہ کی شدید مخالفت کے باوجود سیاسی حل کے تلاش کی کوششیں 1987ء کے دوران جاری
رہیں۔ کونٹاڈورا ممالک کی ثالثی کی وجہ سے وسطی امریکہ کے رہنما اگست 1987ء میں ایک عبوری امن
معاہدے پر متفق ہو گئے۔ امریکہ کے لئے یہ سخت پریشانی کا دور تھا، اسے گزشتہ برسوں کی اپنی ان کوششوں
پر پانی پھرتا ہو محسوس ہو رہا تھا جو اس سیاسی تصفیے کو روکنے کے لئے کی گئیں تھیں۔ خطے میں امریکہ کی برتری
صرف تشدد کے استعمال میں تھی اور اس کا سیاسی اثر و رسوخ صرف فوجی حکمرانوں اور امراء تک محدود تھا اس
لئے اسکے پاس طاقت کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسکے برعکس نکاراگوا کی طرف سے امن کی
کوششیں جاری رہیں جس میں سرحدوں پر بین الاقوامی افواج کا تعین، بیرونی فوجی اڈوں کا خاتمہ،
مشیروں کی واپسی اور کونٹاڈورا ممالک کے تجویز کردہ معاہدے کی منظوری شامل ہے۔ اس کے علاوہ عالمی
عدالتِ انصاف، سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں بھی اس مسئلے کو اٹھایا گیا۔

وسطی امریکہ کے معاہدے کے پیشِ نظر تاریخ کی تطہیر کا کام اشد ضروری ہے۔ "ہمیں ایک نیا رُخ
اختیار کرنا پڑے گا جس کا ذکر رابرٹ ہنٹر نے نہایت احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔ رابرٹ ہنٹر سنٹر فار سٹریٹجک
اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز میں سینئر ریسرچ فیلو ہیں اور بین الاقوامی تعلقات پر ایک ممتاز مبصر کی حیثیت سے جانے
جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ باغی سینڈینسٹا حکومت کے
ارادوں کو شکست دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ نکاراگوا میں جمہوریت کی قیمت امریکی جانوں کی قربانی
کی صورت میں ہی ادا کرنا پڑے گی۔ امریکہ جیسے ملک کے لئے یہ بہت بڑی قیمت ہے۔

> اسکے برعکس باغی ایک دوسرے مقصد کے حصول میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی کاوشوں
> کی وجہ سے نکاراگوا کی حکومت کو امن کا راستہ اپنانا پڑا۔ باغیوں کی ان کوششوں کو امریکی
> سیاسی نظام کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ تاہم باغیوں کا اصل مقصد سینڈینسٹا حکومت کا تختہ
> الٹنا ہے۔[5]

تاریخ کی اس وضاحت میں ایک سقم موجود ہے۔ ہمارے لئے یہ توجیہہ ناقابلِ قبول ہے کہ

یہ مسائل جن پر خطے کے ممالک کئی برسوں سے زور دے رہے تھے کسی بھی وقت بات چیت کے ذریعے حل کیے جا سکتے تھے لیکن امریکی انتظامیہ کی مسلسل مخالفت کی وجہ سے اس کا کوئی بروقت حل نہیں ڈھونڈا جا سکا۔ اسے رد کرتے ہوئے ہمیں ہنٹر کے نقشِ قدم پر ہی چلنا ہوگا اور نئے راستے تلاش کرنا ہوں گے۔

جیمز روہور (James Rohwer) نیویارک ٹائمز میں اسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امریکی جارحیت نے نکاراگوا کو امن معاہدوں کی شرائط پر مجبور کیا۔ ان معاہدوں نے سرحدوں کی حفاظت اور سلامتی کو یقینی بنایا اور خطّے کے ممالک کو نکاراگوا کی جارحیت سے محفوظ کیا۔ ان معاہدوں نے نکاراگوا میں موجود ہٹلر کے پیروکاروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے مصائب و آلام کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ یہ مصائب نکاراگوا کے اپنے ہی پیدا کردہ تھے اور امریکہ کی جارحیت کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔''[6]

اگر امریکہ کی جانب سے کسی قسم کی جارحیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو تو دہشت گردی کے کلچر میں یہ جارحیت بھی قابلِ ستائش ہی ٹھہرے گی۔

ایک طرف ہنٹر کے دلائل مبہم ہیں تو دوسری طرف روہور کے خیالات کچھ زیادہ ہی بے رحم ہیں۔ ہمیں واقعات کی زیادہ نفیس تعلیل کی ضرورت ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ امریکی جارحیت نے سینڈینسٹا کو ان شرائط پر مجبور کیا جو نکاراگوا میں جمہوریت کی بات کرتی ہیں اور ہمسایہ ممالک کو براہِ راست خطرے سے نجات دلاتی ہیں۔ ان شرائط کو ماننے میں نکاراگوا کے رہنما پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وضاحت کے حق میں دلائل پیش نہیں کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاستی پراپیگنڈہ کے سحر میں رہتے ہوئے کسی قسم کے دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن ہم اس دلیل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔ آیئے ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تاریخ کے کس مقام پر امریکہ نے یہ پیشکش کی کہ نکاراگوا کی طرف سے معاہدوں کی شرائط ماننے پر باغیوں کو امریکی امداد بند کر دی جائیگی؟ یا کب نکاراگوا نے بات چیت کے دروازے بند کر کے امریکی غیرت کو للکارا؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ محنت درکار نہیں ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی کوئی تجویز کبھی امریکی رہنماؤں کے زیرِ غور نہیں رہی۔ امریکہ نے آغاز ہی سے سفارتی عمل کو سبوتاژ کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اگست 1987ء کے معاہدوں پر امریکی ردِعمل فوری اور شدید ہے۔ جب بھی خطے میں سفارتی عمل یا بین الاقوامی قانون کی مدد سے کوئی حل ڈھونڈنے

کی کوششیں کی گئی، امریکہ نے اسی روایتی جارحیت سے کام لیا۔ اس جارحیت کی اصل وجوہ ہم سے کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہیں لیکن ہم اسے ماننے سے انکاری ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کی طرح تاریخ کو مسخ کرنے کی یہ کوشش بھی کامیاب رہے گی، اس نظریے میں موجود لغویات امریکی علمی حلقوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر پائیں گی۔ اب ہم بغور جائزہ لیتے ہیں کہ یہ مسائل کس طرح پیدا ہوئے اور ان کے کامیاب حل کو یقینی بنانے کے لئے بنیاد کیسے فراہم کی گئی۔ اس نظریے کی حمایت بڑے زور و شور سے ہونی چاہیے کیونکہ اعمالِ ماضی کا جواز ڈھونڈنے کے علاوہ بھی بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ ہمیں ایک ایسی بنیاد تیار کرنا پڑے گی جو اندریں حالات طاقت کے استعمال کا جواز پیش کر سکے۔

سیاسی حل چونکہ امریکی ترجیحات سے میل نہیں کھاتا اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔ حقائق خواہ کچھ بھی ہوں ہمیں ایک ایسے نتیجے کی ضرورت ہے جو ہمارے نظریے کے قیام میں معاون ہو، چنانچہ اس سے بہتر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ طاقت کے استعمال نے دشمن کو مذاکرات کی میز تک آنے پر مجبور کر دیا۔ ایسی صورتِ حال کا مستقبل میں ظہور پذیر ہونا بھی یقینی امر ہے، اس لئے تحریف نویسی کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رہے کہ ہم دلائل و توجیہات کا مناسب اسلحہ خانہ تیار رکھیں جو بوقتِ ضرورت کام میں لایا جا سکے۔

ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھا کر صورتِ حال کو مبہم بنایا جا سکتا ہے۔ ہم انہی وضاحتوں اور دلائل کو قبول کریں گے جو ہمارے نظریاتی معیار پر پورا اترتے ہوں۔ یہ منزل ہم حقائق میں ردّ و بدل یا انہیں غائب کر کے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری ماضی کی حرکتوں پر کسی قسم کا اعتراض بے موقع ہی ہوگا کیونکہ اب ہم اپنا 'راستہ تبدیل' کر چکے ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ ان مظالم کے پیچھے کارفرما ڈھانچہ اور منصوبہ سازی کا نظام جوں کا توں قائم ہے۔ تنظیمی حلقوں میں آج بھی مسائل تک پہنچنے کی کوشش شاذ و نادر ہی کی جاتی ہے، دوسری طرف عوامی حلقوں پر ابھی تک ویت نام کا خوف جاری ہے۔

'راستے کی تبدیلی' کا یہ نظریہ بڑی آسانی سے ماضی کی بھیانک تصویروں کو ہمارے ذہنوں سے محو کر دیتا ہے۔ یہ نظریہ دہشت گردی کی فضا میں بڑا کارآمد ہے۔ اسے 1987ء کا پولٹزر (Pulitzer) انعام جیتنے والے چارلس کروتھیمر (Charles Krauthammer) نے بڑے عامیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق آج کے دور کا مقابلہ ہم نہ تو روز ویلٹ یا آئزن ہاور کے

دور سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی صدارتی مہم کے دوران کئے گئے صدر ریگن کے وعدوں سے کر سکتے ہیں۔

آج تیسری دنیا کے ممالک میں جمہوریت کا فروغ امریکی خارجہ پالیسی کی اولین ترجیح ہے۔ یہ درست ہے کہ آزادی کبھی امریکہ کا مقصد نہیں رہا، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ آج ہم آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں امریکی اداروں کا کردار اور ان کا طریقہ کار اب قصۂ پارینہ ہے۔[7] زمانہ حال کے واقعات کا ہم اسی احتیاط اور ایمانداری سے ناقدانہ جائزہ لیں گے جس کا مظاہرہ ہم نے ماضی میں کیا۔ تاہم اس وقت جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں کہیں کہیں داغِ ندامت ضرور نظر آتے ہیں۔

اس نظریے کی ایک ترقی یافتہ شکل، لندن سے شائع ہونے والے ایک قدامت پسند جریدے سپیکٹیٹر (Spectator) کے مدیروں نے پیش کی ہے۔ انکے مطابق، ماضی کے واقعات کی روشنی میں امریکہ کا وسطی امریکہ میں جمہوریت سے لگاؤ عمومی طور پر اور نکاراگوا میں خصوصی طور پر عجیب محسوس ہوتا ہے۔ یہ منافقت، جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے، امریکی کردار پر ایک دھبہ ہے۔ جریدے کے مطابق ایسی سوچ نامناسب ہے کیونکہ یہ کسی قوم کو ماضی سے کٹ کر نئی حکمت عملی اختیار کرنے کا حق نہیں دیتی۔ معاملات کا فیصلہ ان کے میرٹ پر ہونا چاہیے۔ نکاراگوا کے خلاف امریکی جنگ کا فیصلہ بھی بالکل واضح ہے۔ اس پر اعتراض چند مغربی مارکسسٹ ہی کر سکتے ہیں جن کی آنکھوں کو سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں سستے گھروں، خواتین کی انجمنوں اور متعدی بیماریوں کے خلاف حفاظتی ٹیکوں جیسے منصوبوں کی چکا چوند نے خیرہ کر رکھا ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے امراء اور مراعات یافتہ طبقے نے ہمیشہ ایسی لغویات کے خلاف اظہار نفرت کیا ہے جیسا کہ **1943**ء میں ونسٹن چرچل نے جوزف سٹالن کو لکھا تھا:

> ''دنیا کی حکمرانی کا فرض آسودہ قوموں کو ہی سونپا جانا چاہیے۔ ایسی قومیں اپنے حال پر مطمئن ہوتی ہیں۔ اگر دنیا کی حکمرانی مفلس قوموں کے ہاتھ میں ہوگی، تو ہمیشہ ایک خطرہ منڈلاتا رہے گا۔ ہم اس سے زیادہ کے متلاشی نہیں ہیں جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ دنیا میں امن وہی لوگ قائم کریں گے جن کے زندہ رہنے کا اپنا ایک طریقہ ہے اور وہ ہوس کے پجاری نہیں ہیں۔ ہماری طاقت ہمیں دنیا میں جداگانہ مقام عطا کرتی ہے۔ ہم ان امراء کی طرح ہیں جو بڑے سکون سے اپنے گھروں میں رہائش پذیر ہیں۔''

سپیکٹیٹر لکھتا ہے کہ غریب تو میں ابھی تک اپنے بچوں کو بیماریوں سے بچانے، غرباء اور فاقہ کشوں کو روٹی کپڑا اور مکان مہیا کرنے اور عورتوں کو غلامی سے نجات دلانے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ اپنی خوبیوں اور اچھے کاموں کی وجہ سے آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں وہاں ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان کوششوں کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکیں۔[8]

اپنی تمام تر زیر کی کے باوجود سپیکٹیٹر کے مدیر چند نکات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

1۔ جہاں تک جارحیت کے اہداف کے انتخاب کا معاملہ ہے امریکہ اور دوسری 'آسودہ قوموں' کی پالیسیوں میں خاصا تسلسل پایا جاتا ہے۔ تاریخ خود اس کی گواہی دیتی ہے۔

2۔ نظریاتی مینیجر بھی ان حقائق پر پردہ ڈالنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں، اگر ہم اپنے بنائے ہوئے عقائد کی دیواریں گرا کر دیکھیں تو یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔

3۔ وسطی امریکہ میں جمہوریت کے قیام کے متعلق امریکہ کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خاص طور پر 1980ء کی دہائی میں ایسی تمام کوششوں کی ناکامی میں امریکہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔[9]

جمہوریت کی تعریف امریکہ نے ہمیشہ اپنی سہولت کے مطابق کی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف نکاراگوا میں 1979ء میں سوموزہ حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جمہوریت کے لئے خاص لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، تو دوسری طرف ایل سیلواڈور میں جو ادارے حقیقی جمہوریت کی بنیاد فراہم کر سکتے ہیں ان کی تباہی کے لئے ظلم و بربریت کا بازار گرم کر دیا جاتا ہے۔ امراء کا ایسا طبقہ پیدا کرنے کے علاوہ جو امریکی ہاں میں ہاں ملائے، امریکی پالیسی میں کبھی کوئی تسلسل نظر نہیں آیا۔

'راستے کی تبدیلی' کے نظریے کا اہم نتیجہ یہ ہے کہ امریکی معاشرے اور تاریخ پر کئے جانے والے تمام تجزیے اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ چونکہ ہم نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا ہے، اسلئے ہم تاریخ کے تمام اسباق کو بھلا کر نئے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اس طرح امریکی معاشرہ، اس کی روایات اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کا بوجھ بھی ہمارے سر پر نہیں ہوگا۔ ان موضوعات پر تمام تصانیف اپنی اہمیت کھو بیٹھیں گی

اور بالائے طاق رکھ دی جائیں گی۔ مزید برآں اگر موجودہ تجزیوں کے نتائج ہماری مرضی کے موافق نہ ہوں تو انہیں بھی رد کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ اپنا راستہ تبدیل کرتے ہوئے نئے سرے سے آغاز کر سکتے ہیں۔ علمی ماحول کی سب سے بڑی خصوصیت دو سوالات سے ناواقفیت ہونی چاہیے۔

1۔ ہم کون ہیں؟ اور 2۔ اس دنیا میں ہم کیا کر رہے ہیں؟

یہ بات ہم جانتے ہیں کہ جہالت سب سے بڑی طاقت ہے۔ حقائق و واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ نظریہ اپنے اندر بہت افادیت اور اہمیت رکھتا ہے۔

خودی کے متعلق 'نظریہ تجاہلِ بالمقصد' کی غیر معمولی صلاحیت 'راستے کی تبدیلی' کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔ جب بھی حقائق سے نظریں چرانے کی ضرورت ہو تو یہ نظریہ ہماری مدد کو آتا ہے۔ مثال کے طور پر جب 1987ء میں ایران کو اسلحے کی فراہمی کے متعلق مقدمہ چلایا جا رہا تھا تو امریکہ اور اس کے ذرائع ابلاغ کے دوغلے پن کی قلعی کھل گئی۔ یہ بات واضح تھی کہ جہاں تک کانگریس کی ہدایات یا بین الاقوامی معاہدوں کی پاسداری کا تعلق ہے ریگن انتظامیہ پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وسطی امریکہ میں ہمارے کردار نے ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس دعویٰ کو مستحکم کیا۔ 3 اگست کو جب کانگریس میں وسطی امریکہ سے متعلق بحث ختم ہوئی تو اس کے دو دن بعد ریگن انتظامیہ نے ایک امن معاہدے کی تجویز پیش کی۔ میں اسکے اوقات اور پسِ منظر پر بعد میں بحث کروں گا لیکن اس کے بنیادی نکات پر ذرا غور کیجئے۔ نکاراگوا میں سیاسی نظام کا خاتمہ، نئے انتخابات، امریکی حملوں کے پیش نظر نافذ کئے جانے والے ہنگامی قوانین کی معطلی، سینڈینسٹا اور باغیوں کے درمیان جنگ بندی اور کیمونسٹ ممالک سے اسلحے کے حصول پر پابندی اس کے چیدہ چیدہ خدوخال تھے۔ کیمونسٹ ممالک سے اسلحے کے حصول پر پابندی کا سیدھا سادہ مطلب یہی تھا کہ نکاراگوا کو اسلحے کی فراہمی بالکل بند ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ بہت سال پہلے امریکہ نے اس بات کو یقینی بنادیا تھا کہ نکاراگوا کو اپنے دفاع کے لئے سوویت بلاک پر انحصار کرنا پڑے۔ معاہدوں کی ان تمام شرائط کے بدلے میں امریکہ یہ ضمانت فراہم کرے گا کہ ہنڈرس میں موجود اُس باغی فوج کو اسلحے کی فراہمی بند کردی جائے گی جو امریکہ نے نکاراگوا پر حملے کے لئے تیار کر رکھی تھی۔[10]

ہم اس سوال کو ایک طرف رکھتے ہیں کہ پورے وسطی امریکہ میں نکاراگوا کو ہی کیوں تخفیفِ اسلحہ اور اندرونی تبدیلیوں پر مجبور کیا گیا؟ اور اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دونوں فریقین کے لئے اسلحے کی فراہمی روکنے کی شرط کیوں تجویز کی گئی؟ اگر نکاراگوا اس معاہدے پر عمل درآمد کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اسکی

طرف سے معاہدے کی شرائط کی پابندی کا باآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ امریکہ باآسانی یہ
بہانہ بنا سکتا ہے کہ نکاراگوا معاہدے کی پابندی نہیں کر رہا ہے۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا
کہ یہ جھوٹ اخبارات کی شہ سرخیاں بنے جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال
سینڈینسٹا پر سیلواڈور کے گوریلوں کی حمایت کا الزام ہے۔ مبصرین نے اس الزام کو ثابت کیا حالانکہ اس
سلسلے میں ٹھوس حقائق مہیا نہیں کئے گئے تھے۔ سوویت مِگ طیاروں کے متعلق غلط خبریں پھیلائی گئیں
لیکن یہ اس لئے کیا گیا کہ نکاراگوا میں ہونے والے 1984ء کے عام انتخابات کی اہمیت کو ظاہر کیا
جائے۔ یہ سب کچھ اولیور نارتھ کی اچھل کود کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ [11] سرکاری حلقوں کے مطابق یہ
انتخابات اتنے غیر اہم تھے کہ ان کا ذکر بھی وقت کا ضیاع تھا۔ [12] اسکے برعکس معاہدے کی شرائط پر ریگن
انتظامیہ کی پابندی کو کسی طریقے سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انتظامیہ کے لئے اپنے منتخب کردہ
راستے پر چلنا ممکن تھا، کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی گئی شرائط اس کا راستہ نہیں روک سکتی تھیں۔ امریکہ جب بھی
چاہتا باغیوں کو ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر سکتا تھا اور حملوں کے متعلق نئی ہدایات جاری کر سکتا تھا۔ یہ
خیالات کہ امریکی کانگریس یا میڈیا ان واقعات کا پردہ چاک کر دیں گے، اتنے مضحکہ خیز ہیں کہ ان پر
بات بھی نہیں کی جا سکتی۔

اگر ہم ٹیلی ویژن سکرین پر پیش کی جانے والی کہانیوں اور اخبارات کا حصّہ بننے والی خبروں پر
ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں ان نتائج پر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی، لیکن میڈیا ان تمام حقائق سے بالکل
غافل رہا۔ امن اور جارحیت پسند، دونوں قوتوں نے اس معاہدے کے غالب امکانات کا جائزہ لیا لیکن
کسی نے اس معاہدے کی بنیادی لغویات پر بحث نہیں کی، جس کے تحت نکاراگوا اسلحے میں تخفیف کرے گا
اور بدلے میں صدر ریگن اور ان کے حواری صرف اچھے برتاؤ کی ضمانت دیں گے۔ [13] ہر کسی نے یہی
فرض کیا کہ ریگن انتظامیہ کے رویے میں معجزانہ تبدیلی آئے گی اور یہ اچانک اپنا راستہ تبدیل کرتے
ہوئے قانون کی پاسداری کو اپنا شعار بنا لے گی اور یہ سب کچھ کسی مناسب نگرانی کے بغیر ہوگا۔ ان شکوک
پر بھی بحث کی گئی کہ نکاراگوا دروغ گوئی اور دھوکا دہی سے کام لے گا جیسا کہ تمام کمیونسٹ ممالک کا وطیرہ
ہے۔ لیکن امریکہ کی نیت پر کسی نے شک و شبے کا اظہار نہیں کیا۔ چند دنوں بعد جب وسطی امریکہ کے
ممالک نے ریگن امن منصوبہ رد کرتے ہوئے ایک عارضی معاہدے پر دستخط ثبت کر دیئے تو اس پر کونسل
برائے بین الاقوامی تعلقات کے پروگرام ڈائریکٹر نے سخت الفاظ میں تنبیہہ کرتے ہوئے کہا ''معاہدے

میں ایک بڑا خلا موجود ہے، یہ عدم اطاعت کے سلسلے میں لگائی جانے والی پابندیوں پر خاموش ہے۔" یہ بلا شبہ ایک اہم نکتہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال کیونکر پیدا ہو سکتی تھی؟ اسکی واحد تشریح یہی بیان کی گئی کہ نکاراگوا میں موجود مارکسسٹ حکومت سے معاہدے کی خلاف ورزی کی توقع کی جا سکتی ہے۔[14] اس کے علاوہ اور کوئی مسئلہ زیرِ بحث نہیں آیا۔

ریگن انتظامیہ کی جارحانہ پالیسیوں کے ناقدین اس بات کا ادراک کر سکتے ہیں کہ نکاراگوا کے بھی کچھ خدشات ہوں گے۔ وائین سمتھ باغیوں کی امداد کے خلاف ایک زوردار آواز ہے، انہوں نے ہمیشہ مسئلے کے سفارتی حل کی تلاش پر زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں نکارگوا سے ہمارا معاہدہ وسطی امریکہ کے معاہدے کا منطقی نتیجہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بے شک ہمیں کسی مناسب ضمانت کی ضرورت ہے ایسی ہی ضمانت سینڈینسٹا کو بھی درکار ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ معاہدے کی اطاعت کی یقین دہانی باغی نہیں کرائیں گے۔ ہماری طاقت اور عزت اس چیز کی یقین دہانی کرائے گی۔"[15]

مختصراً یہ کہ ہماری طاقت ان کی اطاعت کی یقین دہانی کرائے گی اور ہماری عزت اس چیز کو یقینی بنائے گی کہ ہم معاہدے کی اطاعت کریں اس طریقے سے نکاراگوا کے خدشات میں کمی کی جا سکتی ہے۔

امریکی ذرائع ابلاغ اور علمی حلقوں نے کبھی بھی گذشتہ برسوں کے دوران کیے جانے والے معاہدوں پر بحث نہیں کی، ان سے اس بات کی امید بھی عبث ہے۔ مثال کے طور پر 1954ء کے جنیوا معاہدے اور 1973ء کے پیرس امن معاہدے کی دھجیاں امریکہ ہی نے اڑائی تھیں۔[16] اس کے متعلق کسی گوشے سے کوئی آواز بلند نہیں کی گئی۔ یہاں امریکہ کے زیرِ سایہ ایل سیلواڈور کی حکومت سے بھی یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ اندرونی آزادی کے متعلق وسطی امریکہ کے معاہدے کی پابندی یا پاسداری کرے گی۔ ایل سیلواڈور پر ابھی تک فوج کی حکمرانی ہے جس نے حال ہی میں ذرائع ابلاغ اور سیاسی مخالفین کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ 'نظریہ تجاہل بالمقصد' کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ دس ماہ تک زبان زدِ عام رہنے والی خبریں امریکی رویے میں معجزانہ تبدیلی کی وجہ سے ایک لمحے میں بھلائی جا سکتی ہیں۔ اس نظریے کی پکڑ اتنی سخت ہے کہ مسائل پر بحث کا آغاز ہی ممکن نہیں ہے، حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹا مشاہدہ بھی آگاہی کی حدود سے پرے بستا ہے۔ امریکہ اور اس کے رہنما اچھے ہیں، اسکے سوا تمام حقائق کتنی بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیے جائیں، بے سر و پا ہیں۔

اس نظریے کے ساتھ وابستگی ہمیں بہت سے انعامات سے نوازتی ہے۔ یہ طاقت کے دریچوں میں ہمارا تعارف کراتی ہے اور بہت سی مراعات عطا کرتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ سوچ، تحقیق اور دلائل کے سخت ترین مطالبات سے نجات ہے۔ ہمیں ثبوت اور عقلی دلائل کی تلاش سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں میں جراتِ تحقیق پائی جاتی ہے انہیں ثبوت اور دلائل کے اعلیٰ ترین معیار حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے مقام پر وسائل کی کمی مشکلات میں اضافہ کر دیتی ہے اور تنہائی، اندھیرے اور ناواقفیت کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نتائج غیر روایتی اور بالکل نئے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ ہم سائنسی مضامین پر بحث نہیں کر رہے، جہاں اشیاء کو پرکھنے کی کسوٹی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو خیالات پر سٹالن کا دُم چھلا لگا کر رد کر دیا جاتا ہے۔[17] نکاراگوا کے حوالے سے کسی قسم کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے اتنا ہی کافی ہے: ''چونکہ یہ سینڈینسٹا کا حامی ہے اس لئے ناقابلِ اعتبار اور نامعقول ہے۔'' صرف وہی لوگ قبولیت کی سند پائیں گے جو سینڈینسٹا کے مخالف ہیں اور اس طرح امریکی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ایل سیلواڈور کے حوالے سے وہ لوگ ناقابلِ قبول اور نامعقول ہیں جو گوریلا طاقتوں کے حامی ہیں۔ واحد معیار امریکی منصوبوں کی مکمل حمایت ہے، جو لوگوں کو نقائص سے پاک کرتی ہے۔ آزاد سوچ کو زچ پہنچانے کے لئے لفاظی سے بھرپور بہت سے نعرے بنائے گئے ہیں۔ جیسے 'مارکسسٹ' 'انتہا پسند' 'بیوقوف مگر مفید' اور اس طرح کی دیگر بہت سی اصطلاحات جن کا تعلق لینن سے جوڑا جاتا ہے۔ وہ اصطلاحات جو کبھی مثبت معنوں میں استعمال ہوتی تھیں اب صرف مخالفین کو گالیاں دینے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہم شائستگی کی حدود سے باہر نہیں نکلتے اور ذوقِ سلیم گرانی محسوس نہیں کرتا، لیکن جن نعروں اور اصطلاحات کی ہمیں ضرورت تھی انہیں شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمام امور کس طرح انجام پا رہے ہیں اور اس سے ہم اپنے معاشرے اور علمی حلقوں کی کارکردگی کے متعلق کیا سیکھ سکتے ہیں؟

باب 2

ثقافتی اور تاریخی سیاق وسباق

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا کہ 1980ء کی دہائی میں وقوع پذیر ہونے والے دو ''اہم واقعات'' امریکی سیاست اور معاشرے میں ''اہم موڑ'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان واقعات نے ساٹھ کی دہائی کے ''انتشار'' اور ''لاقانونیت'' کے مزاج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شائستہ اور محب وطن امریکیوں نے فخر، حب الوطنی اور ان اقدار اور خوبیوں کی طرف لوٹنے کا مطالبہ کیا، جو ویت نام کی جنگ میں پامال ہو کر رہ گئی تھیں۔[1] رونالڈ ریگن کی شکل میں بظاہر انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہ اقدار اور خوبیاں ملک سے باہر ریگن کے نظریات اور ملک کے اندر ریگن کے سماجی اور معاشی پروگرام میں ظاہر ہوئیں۔

ریگن کے دور حکومت کے دوران جس ''اہم موڑ'' کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ وہ غیر حقیقی نہیں ہے لیکن اس میں مبالغے کی آمیزش ہے۔ آیئے ہم مختصر دو سوالات کا جائزہ لیں اولاً یہ ''اہم موڑ'' حقیقت میں کیا ہے؟ دوم یہ کس طرح امریکی معاشرے اور اس کے خدوخال پر اپنے اثرات چھوڑتا ہے، یہاں ہم زیادہ تر امریکہ کی خارجہ پالیسی تک محدود رہیں گے اگرچہ یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔

ہم اس ''اہم موڑ'' سے اپنی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ ریگن انتظامیہ کہ وہ کون سی پالیسیاں ہیں جو اس ''اہم موڑ'' کو ثابت کرتی ہیں؟ بنیادی طور پر اس کی تین اقسام ہیں۔

1۔ غرباء سے امراء کی طرف وسائل کی منتقلی

2۔ ریاست کے معاشی دائرہ کار اور طاقت میں اضافہ

3۔ ایک فعال خارجہ پالیسی

پہلی منزل کا حصول نئی مالیاتی تدابیر اور مزدور و عوامی بہبود کے نظام پر شب خون مار کر کیا گیا، یہ دونوں نظام پہلے ہی بین الاقوامی معیار کے مقابلے میں خاصے کمزور تھے۔ دوسرا پروگرام روایتی طریقے سے پورا کیا گیا۔ ایک طرف ملکی صنعت کی حفاظت کے لئے درآمدات پر ٹیکس لگائے گئے تو دوسری طرف اسے مالی امداد فراہم کی گئی جسے دفاعی اخراجات کا نام دیا گیا۔[2] امریکی تاریخ گواہ ہے کہ زمانہ امن میں ہتھیاروں کے ایسے انبار پہلے کبھی نہیں لگائے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ملکی اخرجات میں اتنے اضافے کی مثال نہیں ملتی۔ عوامی مخالفت اور ردِ عمل سے بچنے کے لئے انتظامیہ نے جو طریقے اختیار کئے ان میں سینسر شپ، سرکاری دستاویز تک محدود رسائی اور خفیہ سرگرمیوں میں اضافہ شامل ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر صدر نے سپریم کورٹ کے لئے اس شخص کو نامزد کیا جس کا ''شخصی آزادی'' کا ریکارڈ قابلِ رشک نہیں تھا۔ اس کے ''آئینی فیصلوں کی بنیاد صرف یہی تھی کہ جب کبھی بھی ریاست اور فردِ واحد مدِ مقابل ہوں تو آخری فتح ریاست ہی کی ہونی چاہیے''۔[3] تیسرے پروگرام یعنی ''فعال خارجہ پالیسی'' کی تکمیل بھی روایتی طریقے سے کی گئی۔ مداخلت، جارحیت، سبوتاژ اور لاقانونیت نظریہ ریگن کے لازمی جز تھے۔ ایل سیلواڈور میں نہایت کامیابی کے ساتھ ریاستی دہشت گردی کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ ان عوامی اداروں کو تباہ کیا گیا جو بنیادی انسانی حقوق کے دفاع کے لئے برسرِ پیکار تھے اس طرح جمہوریت اور سماجی اصلاحات کے خطرے پر قابو پایا گیا۔ آرچ بشپ رومیرو نے (جنہیں بعد میں امریکی پشت پناہ طاقتوں نے قتل بھی کر دیا تھا) صدر کارٹر سے درخواست کی کہ وہ باغیوں کی امداد بند کر دیں کیونکہ یہ ایل سیلواڈور میں ایک بڑی تباہی کا باعث بنے گی۔ اس کا الٹا اثر ہوا، کارٹر کے زمانے کی محدود جنگ ریگن کے دور میں مزید شدّت اختیار کر گئی۔ قتل و غارت اور دہشت گردی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ جن طاقتوں نے یہ تباہی مچائی، انہیں امریکہ کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ ان کی تربیت اور اسلحے کی فراہمی امریکہ ہی کی جانب سے تھی۔ امریکی فوجوں نے براہِ راست بھی اس جنگ میں حصّہ لیا۔ امریکی فضائیہ نے اپنے بیرونی اڈوں سے پرواز کرتے ہوئے حملے کئے، جن میں بہت سے نہتے دیہاتی اور کسان مارے گئے۔ سی آئی اے کے نیم فوجی دستوں نے اپنی جاسوسی مہم جاری رکھی اور ایل سیلواڈور میں حامی فوجوں کے ساتھ جنگ میں حصّہ لیا۔ ریگن انتظامیہ نے اعلان کر رکھا تھا کہ ایل سیلواڈور میں فوجی مشیروں کی

تعداد 55 سے تجاوز نہیں کرے گی لیکن اسے خفیہ طور پر بڑھایا گیا۔ امریکی فوجوں پر عملی طور پر جنگ میں حصّہ نہ لینے کی پابندی کی پرواہ نہ کی گئی۔ امریکی حکومت کے ایک نمائندے نے بیان دیتے ہوئے کہا ''جہاں تک طیاروں کا اپنے اہداف کو نشانہ بنانے کا تعلق ہے یہ کارروائی حیرت انگیز حد تک کامیاب رہی۔''[4] جب اس وحشیانہ دہشت گردی نے اپنے مقاصد حاصل کر لئے اور یہ محسوس کیا گیا کہ جنگ امریکی فوجوں کو امداد کی فراہمی میں رکاوٹ بن رہی ہے تو امریکی حکومت نے اس کی شدت میں کمی کا حکم دیدیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ تاہم امریکی عوام نے اپنے رہنماؤں کی اس ''اعتدال پسندی'' کو بہت سراہا۔ ایسی ہی ایک جنگ صدر ریگن نے نکاراگوا میں بھی شروع کی۔ سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر، سٹینز فیلڈ ٹرنر (Stansfield Turner) نے اپریل 1985ء میں کانگریس کے سامنے بیان دیتے ہوئے اسے ریاستی دہشت گردی کا نام دیا۔[5] عالمی عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اسے جارحیت سے منسوب کیا۔ امریکی امن پسند حلقوں نے جو صدر ریگن کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش کے خلاف تھے۔ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اس جنگ کا مقصد نکاراگوا کو وسطی امریکہ کے دائرہ کار میں واپس لانا اور اسے مجبور کرنا ہے کہ وہ خطے میں قائم کردہ معیار سے انحراف نہ کرے۔''[6]

نکاراگوا میں امریکہ کا مطمع نظر سینڈینسٹا حکومت کو تبدیل کر کے ایک ایسی حکومت کا قیام تھا جو خطے میں قائم کئے گئے امریکی معیار سے مطابقت رکھے اور پانچویں آزادی کی حفاظت کرے۔[7] یہ ایک اہم نظریہ تھا جس کی وضاحت ہمیں تاریخی اور دستاویزی ریکارڈ سے ملتی ہے۔ یہاں امریکہ نے کم از کم دو مقاصد ضرور حاصل کئے۔

1۔ معاشی اصلاحات کا راستہ روکنا اور اب تک کی گئی معاشی اصلاحات کے عمل کا رخ تبدیل کرنا۔ حکومت کی طرف سے جاری کردہ صحت، معاشی ترقی غرباء کے لئے ترقیاتی منصوبے اور خواندگی جیسے پروگراموں کو ختم کیا گیا۔

2۔ نکاراگوا کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے سوویت یونین پر انحصار کرے۔ بعد میں اسے بہانہ بنا کر نکاراگوا پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ بات بہت پہلے سے واضح ہو چکی تھی کہ امریکی خارجہ پالیسی کی بدولت نکاراگوا جلد یا بدیر سوویت یونین کی

جھولی میں جا گرے گا۔[8] اس مقصد کے حصول کے لئے امریکہ نے سینڈینسٹا حکومت کے طرف سے اسلحے کی فراہمی اور فوجوں کی تربیت کی درخواست مسترد کردی۔ حلیف ممالک پر یہی پالیسی اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔

اس طرح یہ یقینی بنایا گیا کہ دوسرے تمام ذرائع کی عدم موجودگی میں نکاراگوا مکمل طور پر سوویت اسلحے پر انحصار کرے۔ بین الاقوامی اداروں کی طرف سے دی جانے والی امداد کو روکنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا گیا۔ مئی 1985ء میں نکاراگوا کے ساتھ ہر قسم کی تجارت پر پابندی لگا دی گئی۔ اس پابندی سے پہلے نکاراگوا کی سوویت بلاک کے ساتھ تجارت 20 فیصد تھی۔ کم وبیش یہی صورتِ حال امریکہ کے ساتھ تجارت میں بھی تھی۔ یورپ اور تیسری دنیا کے مقابلے میں یہ شرح کافی کم تھی لیکن امریکی دہشت گردی کے حامیوں نے اسے بہانہ بنایا اور جارحیت کو سوویت توسیع پسندی روکنے کے لئے ضروری خیال کیا۔[9] امریکہ کی انہیں پالیسیوں کے پیشِ نظر ''آزاد پریس'' نے نکاراگوا حکومت کے لئے ''ماسکو کی پشت پناہی'' جیسے الفاظ استعمال کیے اور شاید یہ درست بھی تھا کیونکہ امریکی دہشت گردی نے نکاراگوا کو مجبور کردیا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے سوویت یونین کا سہارا لے۔ امریکی پریس نے زور دیا کہ اس جنگ میں نکاراگوا کو سوویت یونین کی جبکہ باغیوں کو امریکی امداد حاصل ہے۔ اس طرح ایک ایسا نقشہ تیار کیا گیا جس سے محسوس ہو کہ یہ جنگ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ حکومتی پراپیگنڈہ کا یہی تقاضہ تھا۔[10] سوویت اسلحے کے خلاف خوف وہراس کی فضا پیدا کی گئی اور باغیوں کی حالتِ زار پر ان الفاظ میں ماتم کیا گیا کہ ''غریب فوجی مرہم پٹیوں میں لپٹے ہوئے سوویت ہیلی کاپٹروں کا مقابلہ کر رہے ہیں''۔ (ہم حقیقت کا بعد میں جائزہ لیں گے) ان تصویروں نے آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ بہت سے لبرل ناقدین کو بھی اپنے حال میں پھنسا لیا گیا۔ مبصرین نے لکھا کہ نکاراگوا کا مقصد اگر ٹیکساس پر حملہ کرنا (جیسا کہ ریگن نے کہا تھا) یا سوویت یونین کو امریکہ پر حملے کے لئے اڈے فراہم کرنا (جنرل جان سنگ لوب کے مطابق) نہیں تو وہ کم از کم سوویت یونین کے ایجنٹ کے طور پر پورے وسطی امریکہ پر قبضہ ضرور کرنا چاہتا ہے۔[11]

''فعال خارجہ پالیسی'' کے نام پر خطے میں جو دوسرے اقدامات کئے گئے اس میں گوئٹے مالا میں ظلم کی حمایت شامل ہے۔ یہ ظلم وزیادتی اس وقت سے جاری تھی جب 1954ء میں جمہوریت کا خاتمہ کیا گیا۔ لیکن حالیہ واقعات کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہنڈرس میں امریکی فوجی اڈے قائم کئے گئے

جہاں سے بین الاقوامی دہشت گردی کوفروغ دیا گیا۔ کوسٹاریکا میں پہلے معاشی بدحالی پھیلائی گئی اور پھر جمہوریت کو تہہ بالا کر دیا گیا، بعد ازاں اسے اس جہاد میں شریک کر لیا گیا جو امریکہ نے خطے میں جمہوریت اور معاشی اصلاحات کے خلاف شروع کر رکھا تھا۔ وسطی امریکہ میں وسیع پیمانے پر قتل وغارت کا سبب نظریہ ریگن ہی تھا۔ ریگن کے دورِ حکومت میں ایل سیلواڈور میں مرنے والوں کی تعداد 50,000 سے تجاوز کر گئی۔ گوئٹے مالا میں یہ تعداد تقریباً 100,000 تھی۔ نکاراگوا میں دہشت گردی کے نتائج امریکہ کے حق میں اتنے سازگار نہ تھے۔ یہاں 1986ء تک صرف 11,000 لوگ لقمہ اجل بن سکے۔[12] اسکی وجہ یہ تھی کہ نکاراگوا میں عوام کی حفاظت کے لئے فوج موجود تھی جبکہ ایل سیلواڈور اور گوئٹے مالا میں فوج ہی عوام کے خلاف دہشت گردی میں مصروف تھی۔ ریگن کے دورِ حکومت میں وسطی امریکہ میں 150,000 سے زیادہ نفوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ کوئی عام قتل وغارت نہ تھی یہاں طریقہ واردات بالکل پول پاٹ * جیسا تھا۔ اذیت، عصمت دری اور اعضاء کا کاٹنا ان کے مخصوص اجزاء تھے اور اسکا مقصد عوام پر کاری ضرب لگانا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بیس ہزار سے زیادہ افراد لبنان میں مارے گئے، جب اسرائیل نے امریکہ کی شہہ پر مداخلت کی ان میں زیادہ تر تعداد بے گناہ شہریوں کی تھی، مجموعی طور پر ہزاروں لاکھوں لوگ دہشت گردی، فاقہ کشی اور بیماریوں کا شکار ہوئے۔ فعال خارجہ پالیسی کی ایک اور مثال لیبیا پر فضائی حملہ تھا جس میں کوئی سو کے قریب لوگ مارے گئے۔ یہ اس سال کے دوران دہشت گردی کا بدترین واقعہ تھا، اس کے علاوہ نمیبیا پر جنوبی افریقہ کے قبضے کو برقرار رکھنے کے لیے خاص اقدامات کیے گئے تاکہ ہمسایہ ممالک ذہنی آزادی کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہ لا سکیں۔ اس واقعہ پر ذرائع ابلاغ نے کوئی بحث نہیں کی۔ دہشت گردی کی ان مثالوں کی فہرست کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ تھا وہ ''اہم موڑ''! اب ہم یہاں تین مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں۔

1۔ ان سب پالیسیوں کا قدامت پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ہم اسے جنگجو پن ہی کہیں گے یا پھر اس سے بھی سخت اصطلاحات مناسب رہیں گی۔ امریکی سیاسی نظام میں حقیقتاً کچھ قدامت پسند موجود تھے اور یہ اس زمانے کے علمی ماحول میں اخلاقی بگاڑ کی نشانی ہے کہ

---

* پول پوٹ 1975ء سے 1979ء تک کمبوڈیا حکومت کا سربراہ تھا۔ اس کا اصل نام سیلوتھ سار تھا۔ اسکے کمیونسٹ دورِ حکومت میں عوام کو بہت سی سختیاں برداشت کرنا پڑیں۔ ہزاروں لوگوں کو جلاوطن کر دیا گیا لاکھوں لوگ قتل ہوئے یا اپنا گھر بار گنوا بیٹھے۔ (مترجم)

قدامت پسندی جیسی قابلِ عزت اصطلاح کو ریاست کی لاقانونیت، تشدد اور جارحیت پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

2۔ اس ''اہم موڑ'' کو عمومی طور پر اشراف کی حمایت حاصل تھی ماسوائے ان اختلافات کے جو حکمتِ عملی کا حصہ تھے۔ ان پالیسیوں کا آغاز کارٹر انتظامیہ نے کیا جس میں فوجی تیاریاں، فلاحی ریاست کی تباہی اور ایل سیلواڈور میں دہشت گردی اور قتل و غارت شامل ہیں۔ ان پالیسیوں کی تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو سکتے ہیں لیکن عمومی طور پر ریاست کے تمام حلقوں میں اتفاقِ رائے پایا جاتا تھا۔ اس دور میں سب سے بڑا اختلافی مسئلہ نکاراگوا پر حملے کا تھا جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ امریکہ کے لئے مہنگا ثابت ہو گا لیکن اسے بھی حزبِ اختلاف کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ایل سیلواڈور میں امریکی دہشت گردی کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات پائے جاتے تھے کہ یہ ناکام ہو سکتی ہے، لیکن جلد ہی جوش نے تنقید کی جگہ لے لی۔[13] ہمارے ذہنوں میں یہ رہنا چاہیے کہ ریگن پروگرام کا دوسرا اور تیسرا جزو جان ایف کینیڈی کے پروگرام سے مطابقت رکھتا ہے۔ کینیڈی انتظامیہ کو ریگن پروگرام کا پہلا جزو اپنانے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ احساس اجاگر تھا کہ طاقت کے سہارے امریکہ کے اندر عظیم معاشرے کا خواب اور امریکہ سے باہر تمام تر منصوبے بغیر کسی حیل حجت کے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ (صدر کے مشیر والٹر ہیلر)۔ امریکی طاقت کے زوال کے بعد عظیم معاشرے کے قیام کا خواب ترک کرنا پڑا۔ اس حقیقت کو کینیڈی کے ترقی پسند پیروکاروں نے محسوس کر لیا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے، جو ریگن کے ظلم و ستم کے بہت بڑے حامی تھے۔ مثال کے طور پر ہم جریدہ ''نیو ریپبلک'' کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ جریدہ امریکی ترقی پسندی کا سب سے بڑا آلۂ کار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ریگن کو مشورہ دیا کہ وہ ایل سیلواڈور میں قتل و غارت جاری رکھے اور یہ پرواہ نہ کرے کہ قتل و غارت میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کوششوں میں کامیابی پر اس نے ریگن انتظامیہ کو مبارک باد دی۔ دہشت گردی کے اس ماحول میں ساری کارروائی کے دوران کسی حلقے نے کوئی لب کشائی نہیں کی۔

3۔ اس ''اہم موڑ'' کو عوامی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ صدر ریگن کی مقبولیت میں تیس فیصد تک کمی ہو گئی۔ یہ حالات کے بہاؤ پر بے چینی کا اظہار تھا۔ اگر ڈیموکریٹک پارٹی نے مناسب حکمتِ

عملی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو اس مقبولیت میں مزید کمی واقعہ ہوسکتی تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ کانگریس ریگن حکومت کی قانون سازی کا راستہ روکے گی۔ 1984ء میں صرف ایک فیصد لوگوں نے اس وجہ سے ریگن کو ووٹ دیا کیونکہ ان کے خیال میں وہ صحیح معنوں میں قدامت پسند تھے۔[14] 1980ءمیں یہ تعداد چار فیصد تھی۔ عوام کا جھکاؤ اب رفتہ رفتہ فرینکلن روزویلٹ طرز کی پالیسیوں کی طرف ہوتا جا رہا تھا، جس میں سماجی اہمیت کے کاموں کو فوجی اخراجات پر ترجیح دی جاتی ہے اور خواتین، مزدوروں، اقلیتوں اور غرباء کے حقوق کی حمایت کی جاتی ہے۔[15] نیوکلیئر پروگرام کو ختم کرنے کی عوام کی اکثریت نے حمایت کی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ سوویت یونین پہلے ہی یک طرفہ طور پر ایٹمی اسلحہ خانے میں کمی کا فیصلہ کر چکا ہے تو یہ حمایت اور بھی شدید ہوتی اور بلا شبہ امریکی عوام اپنی حکومت کو اس کی پیروی پر مجبور کرتی۔ مقتدرین میں ''نکاراگوا کی پیش قدمی'' روکنے پر اتفاق رائے تھا اور سینڈینسٹا حکومت کے مثبت اقدام کو جان بوجھ کر عوام تک نہ پہنچنے دیا گیا۔ اسکے باوجود نکاراگوا پر حملے کی عوام نے مخالفت کی۔[16] 1987ء تک یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ عوام اسی شخص کو نیا صدر چنیں گے جو صدر ریگن کی پالیسیوں سے انحراف کرے گا۔ اکثریت کے خیال میں نائب صدر بش کے صدر ریگن کے ساتھ تعلقات ان کے لئے خوش بختی کی بجائے وبالِ جان بن سکتے ہیں۔ عوام یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ ملکی معاملات غلط سمت کی طرف چل نکلے ہیں اور وہ منفی رجحانات اور قنوطیت پھر سے لوٹ رہی ہے، جو پچھلی دہائی میں واٹر گیٹ، تیل کی ترسیل پر پابندی اور افراطِ زر میں اضافے جیسے واقعات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔[17]

مختصراً ریگن کے دورِ حکومت میں اہم موڑ ضرور آیا، لیکن یہ اشراف کی نمائندگی کرتا تھا اور عوامی مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اسے ہم کچھ بھی کہہ لیں قدامت پسندی نہیں کہہ سکتے۔ اشراف کے نقطہ نظر سے ''اہم موڑ'' 1970ء کی دہائی کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ یہ ان مسائل کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوا جو ویت نام کی جنگ نے پیدا کئے تھے، ان مسائل پر ہم معاشیات اور نظم و نسق کے حوالے سے بحث کریں گے۔ امریکہ کو جنگِ ویت نام کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی، جبکہ یہ اُسکے صنعتی حریفوں کیلئے بہت سود مند ثابت ہوئی۔ کینیڈا اسلحے اور جنگی ساز و سامان کے سب سے بڑے برآمد کنندہ کی حیثیت سے اُبھرا۔ ایک طرف تو اس نے امریکہ کی وحشیانہ سرگرمیوں پر ماتم جاری رکھا[18] اور دوسری طرف جوں

جوں ویت نام کی تباہی بڑھتی گئی کینیڈا کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا گیا۔ سب سے اہم معاملہ جاپان کا تھا۔ جاپان کی معاشی حالت کوریا کی جنگ کے دوران بہتر ہونا شروع ہوگئی تھی لیکن اس میں اصل بہتری ویتنام کی جنگ کے دوران ہوئی، جب امریکہ نے فوجی ساز وسامان کی خریداری شروع کی۔ کینڈی حکومت کو یہی پریشانی درپیش رہی کہ کسی طرح جاپانی معیشت کے سنبھلنے کی تدبیر کرے لیکن جنگِ ویتنام کے بعد حالات بالکل مختلف تھے۔ 1965ء میں تجارت کا توازن جاپان کے حق میں ہوگیا تھا لیکن 1980ء کی دہائی میں یہ توازن خطرناک صورت اختیار کرگیا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے تو یہاں یہ توازن 1950ء کی دہائی میں ہی تبدیل ہوگیا تھا[19] اور امریکہ کی طاقت میں نمایاں کمی محسوس کی جانے لگی تھی، یہ سب کچھ ویت نام کی جنگ کی وجہ سے تھا۔ جنوبی کوریا کی معاشی خوشحالی بھی اسی دور کا واقعہ ہے۔ اس عرصے میں کوریا کا 20 فیصد زرِمبادلہ ویتنام کی جنگ کے بدولت ہی تھا، اس میں ان تین لاکھ فوجیوں کی تنخواہیں بھی شامل ہیں جنہیں جنوری 1965ء سے ''جنوبی ویت نام کے دفاع'' کیلئے تعینات کیا گیا۔[20] حکومت کے لئے اشد ضروری ہوگیا کہ وہ امریکی تجارت اور طاقت کی بحالی کیلئے مناسب حکمتِ عملی اختیار کرے اس عمل کا آغاز صدر نکسن نے کیا۔ ان کے اقدامات میں ڈالر کی دوسری کرنسیوں میں تبادلے پر پابندی اور درآمدات پر دس فیصد سرچارج شامل ہیں تجارتی حلقوں میں اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ تاہم آنے والے برسوں میں جو اقدامات اٹھائیں گئے انہیں اشراف کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ان میں معاشرتی پروگراموں کا قتل عام اور ملکی صنعت کے تحفظ کے لئے مالی امداد شامل تھی۔ جب ریگن کے ''اہم موڑ'' کا آغاز ہوا تو اس میں بہت سے دوسرے پروگراموں کا اضافہ ہوگیا۔[21] نظم ونسق کے مسائل دو اقسام کے تھے۔ بین الاقوامی اور داخلی۔ سلطنتِ پرتگال کے خاتمے کے بعد تیسری دنیا کا بیشتر حصہ قابو سے باہر ہوگیا تھا۔ لاطینی امریکہ کے اندر سیاسی ہیجان میں اضافہ ہوا۔ ان مسائل کے حل کے لئے ایک فعال خارجہ پالیسی کی ضرورت تھی، جو فوجی جنگجوپن کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ مقتدرین اور سیاسی طور پر فعال عوامی حلقوں میں ان پالیسیوں کے بارے میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

نظم ونسق کے اندرونی مسائل بھی پیدا ہوئے۔ آبادی کا بیشتر حصہ بے قابو دکھائی دیتا تھا۔ جنگِ ویت نام نے امریکی معاشرے کو سیاسی رنگ دیا۔ سادہ لوگ بھلے ہی اسے جمہوریت کا نام دیں لیکن مغربی مفکرین جانتے ہیں کہ یہ ''جمہوریت کا بحران'' تھا۔ اس بحران پر قابو پانے کا واحد طریقہ یہی

تھا کہ عوام کو غیر متحرک کیا جائے جو کہ اس کی اصل حالت ہے۔ ایسا جمہوریت کی بقا کے لئے اشد ضروری تھا، یہاں جمہوریت سے مراد تجارتی حلقوں کا بلا رکاوٹ اقتدار ہے۔ جہاں تمام اہم فیصلے اشراف کرتے ہیں اور گاہے بگاہے عوامی رائے لے لی جاتی ہے، لیکن عوامی رائے کو کبھی بھی ریاستی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی، اس لئے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ عوام کو بے اعتنائی اور تابعداری کی طرف واپس لایا جائے اور ان اداروں میں نظم و نسق بحال کیا جائے، جو نوجوان نسل میں غیر ضروری نظریات کی فصل بو رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ظاہر ہونے والے نفرت کے جذبات کی ابتدا ہی سے بیخ کنی کی گئی تا کہ اشراف کے اقتدار کو کسی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ مسائل دراصل پوری دنیا میں سر اٹھا رہے تھے، ان پر پہلی دفعہ ''ٹرائی لیٹرل کمیشن'' کی مطبوعات میں بحث کی گئی۔ یہ کمیشن ڈیوڈ راک فیلر کی ایماء پر بنایا گیا تھا جس میں جاپان، یورپ اور امریکہ کی لبرل قوتوں کو اکٹھا کیا گیا۔ اس کمیشن کی 1975ء میں ''جمہوریت کے بحران'' کے نام سے اشاعت کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے۔[22] اس صدی کی ہر بڑی جنگ نے اہم سماجی گروہوں میں اسی قسم کے ردعمل کو جنم دیا ہے۔ ان گروہوں میں تاجر، سیاسی مقتدرین۔ جن کی بنیاد عام طور پر تجارت پر ہی ہوتی ہے، ذرائع ابلاغ اور نظریاتی مینیجر کا کردار ادا کرنے والا مراعات یافتہ علمی طبقہ شامل ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اور بعد میں ولسن انتظامیہ نے بالشیوک انقلاب پسندوں کا بہانہ بنا کر ''سُرخ خوف'' کے پرانے پراپیگنڈہ کا آغاز کیا جو حقیقی معنوں میں ''جمہوریت کے خطرے'' کو دور کرنے کا باعث بنا، جبکہ اورویل کے ہاں جمہوریت کے استحکام میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ترقی پسند حلقوں کی حمایت کی وجہ سے ''سرخ خوف'' مزدور تحریک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کامیاب رہا۔ اس عرصے میں چند دور رس پیش رفت ہوئیں۔

1۔ تعلقات عامہ کی صنعت کا آغاز ہوا جس کا مطمع نظر عوامی ذہن پر قابو پانا تھا۔

2۔ قومی سیاسی پولیس (ایف بی آئی) کی تشکیل عمل میں آئی، تقریباً اسی وقت والٹر لپ مین جیسے آزاد خیال جمہوری نظریہ دانوں نے معاشرے میں ''ہم آہنگی'' کی اہمیت پر بحث کا آغاز کیا۔ ان کا موضوع بحث وہ ممالک تھے۔ جہاں حکومت کے پاس عوام پر قابو پانے اور معاشرے پر دباؤ ڈالنے کے لئے طاقت کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ خیالات بعد میں سوشل سائنس اور تعلقات عامہ کی

صنعت کے مصدر بنے۔

دوسری جنگِ عظیم بھی اپنے ساتھ اسی قسم کے نتائج لے کر آئی۔ ان میں سب سے اہم مظہر کو غلط طور پر ''میکارتھی ازم'' کا نام دیا گیا، یہ ''جمہوریت کے بحران'' پر قابو پانے کی ایک وسیع تر کوشش تھی جس کا ہراول دستہ تاجر، تعلقاتِ عامہ کی صنعت اور لبرل جمہوریت پسند تھے۔ 1938ء میں نیشنل ایسوسی ایشن آف مینوفیکچرز کے بورڈ آف ڈائریکٹر نے یہ خیال پیش کیا کہ ''عوام کو ملنے والی نئی سیاسی طاقت صنعتکاروں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔'' انہوں نے یہ تنبیہہ کی کہ ''جب تک عوام کی سوچ کا دھارا انہیں موڑا جاتا یہ خطرہ مسلسل ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا'' اس خطرے پر قابو پانے کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے گئے اور اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ 1974ء میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تعلقاتِ عامہ کے افسر ملٹن ڈیوس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''تعلقاتِ عامہ کا فائدہ ضرور ہوتا ہے جیسا کہ ماضی میں ہوا اور جیسا کہ مستقبل میں ہوگا اس نے نہایت تیزی سے عوامی رائے کو دائیں طرف موڑ دیا ہے۔ اس وقت باقی دنیا اور یورپ بائیں طرف مڑ رہے ہیں یورپ نے مزدوروں کو حکومت میں شامل کیا ہے اور لبرل قانون سازی کی بنیاد رکھی ہے۔ امریکہ میں یہ فضا خود ہی دائیں طرف نہیں مڑی بلکہ نہایت چابکدستی سے اسے دائیں طرف موڑا گیا ہے۔'' جب اس قسم کی پیش رفت نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا تو اس سے نبٹنے کے لئے امریکی طاقت کا سہارا لیا گیا۔[23]
یہاں یہ نقطہ قابلِ ذکر ہے کہ جنگ اور ہنگامہ آرائی کا دور لوگوں میں سوچنے کے رجحانات کو جنم دیتا ہے اور انہیں معاشرتی اور سیاسی میدانِ عمل میں لا کھڑا کرتا ہے جس سے ''جمہوریت کا بحران'' پیدا ہوتا ہے۔ اشراف کو اپنی مراعات اور طاقت کی حفاظت کے لئے صف بندی کرنا پڑتی ہے۔ موجودہ ''اہم موڑ'' ایک قدرتی امر ہے اسے علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا لیکن عوام کے ہاں اسے زیادہ پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ ریگن کے نظریے کے اہم نکات اسی مسئلے کو حل کرنے کی ایک کوشش ہیں جس پر ہم اب بحث کریں گے۔

باب 3

خفیہ دہشت گردی کے مسائل

زیرِ بحث معاملات سے متعلق امریکی معاشرے کی چار خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

1۔ عوام کی اکثریت کا سیاسی عمل سے اخراج

2۔ علمی حلقوں کا ریاستی طاقت کے تابع ہونا۔

3۔ عوام پر طاقت کے ذریعے قابو پانے کی ریاستی صلاحیت میں کمی

4۔ 1960ء اور 1970 کی دہائی کی تحریکوں کے نتیجے میں عوام کی اخلاقی اور علمی سطح میں نمایاں ترقی۔[1]

ان جزیات کے نتائج خاصے پیچیدہ تھے۔ہم نکاراگوا کی مثال پر غور کرتے ہیں، یہاں باغی فوجیوں نے امریکی مدد سے نکاراگوا پر حملہ کر دیا۔عوام نے عمومی طور پر باغیوں کی مخالفت کی جیسا کہ وہ اب تک ریگن کے تقریباً ہر پروگرام کی کر رہے تھے، لیکن حکومتی پالیسی کے متعلق اہم معاملات کو نہ تو کبھی ذرائع ابلاغ نے چھیڑا اور نہ ہی یہ کبھی سیاسی نظام میں زیرِ بحث آئے۔

اسکے باوجود اختلافات کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے اور ان پر طاقت کے ذریعے قابو نہیں پایا جا سکتا۔ کانگریس کسی حد تک عوامی مزاج سے ہم آہنگ تھی، اس نے نکاراگوا میں جارحیت کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی۔اس بات نے ریگن انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ نکاراگوا میں خفیہ طور پر فوجوں کی مدد کرے باغیوں کو اسلحے کی فراہمی سی آئی اے کی ذیلی تنظیموں اور پرائیویٹ اداروں کی مدد سے کی گئی جنہیں امریکی فوج کے سابق جنرل چلاتے تھے۔ان سب کارروائیوں کو وائٹ ہاؤس کا مکمل تعاون

حاصل تھا۔[2] اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بین الاقوامی دہشت گردوں کو بھرتی کیا گیا۔ اس میں اہم نام لوئی پوسادا کیریلس کا تھا، یہ کیوبا کا ایک جلاوطن تھا جس کی تربیت سی آئی اے نے کی تھی، اس پر الزام تھا کہ اس نے 1976ء میں کیوبن ایرلائن کے ایک طیارے پر بمباری کی جس کے نتیجے میں 76 افراد ہلاک ہوگئے تھے، اس جرم کی پاداش میں وہ وینز ویلا کی ایک جیل میں قید تھا۔ سب سے پہلے تو اس کی رہائی کو ممکن بنایا گیا، اس کے بعد اسے ایل سیلواڈور لے جایا گیا جہاں اس کے ذمے ایلو پانگو کے ہوائی اڈے سے باغیوں کو فراہم کیے جانے والے اسلحے کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔[3] ریگن انتظامیہ نے ورلڈ اینٹی کمیونسٹ لیگ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ یہ جماعت بہت سے نازیوں، دہشت گردوں اور قاتلوں پر مشتمل تھی جنہیں ساری دنیا سے اکٹھا کیا گیا تھا۔ امریکہ کو جنوبی کوریا اور تائیوان کی شکل میں اپنے حلیفوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی، یہ لیگ پورے افریقہ اور لاطینی امریکہ میں دہشت گردی کی علامت بن گئی۔[4] اسرائیل کے ذریعے ایران کو اسلحہ فروخت کیا گیا، اس سے حاصل ہونے والے منافع کو سوئٹزرلینڈ کے بنکوں کے ذریعے باغیوں تک پہنچایا گیا، اسکے علاوہ سعودی عرب اور تائیوان جیسے پرانے اتحادیوں سے کروڑوں ڈالر حاصل کیے گئے۔ برونائی کے سلطان کی شکل میں نئے مواقع تلاش کیے گئے۔ امریکی حکومت ''نکاراگوا میں کیمونسٹ مخالف قوتوں کی مدد کے لئے'' چین اور تائیوان کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب رہی جسے بعد میں فار ایسٹرن اکنامک ریویو نے ''اسلحے کی سیاست کا غیر معمولی واقعہ'' قرار دیا۔ 1984ء میں کیے گئے ایک سودے میں چین نے پرتگال اور کینیڈا کے اسلحے کے تاجروں کے ذریعے ہتھیار باغیوں تک پہنچائے اس سودے میں مالی معاونت تائیوان نے کی[5] اور اسکا اہتمام اولیور نارتھ نے کیا تھا۔ اس سرکاری اور غیر سرکاری تعاون کی سطح اتنی وسیع تھی کہ جب برونائی کے سلطان کی جانب سے فراہم کیے جانے والے دس ملین ڈالر خرد برد کر لیے گئے تو کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ ان ریشہ دوانیوں نے باغیوں کو فضائی اور فوجی سامان کی فراہمی یقینی بنائی اور یہ سب کچھ واضح طور پر کانگریس کی قانون سازی اور اٹھارویں صدی کے غیر جانبداری کے قانون کے خلاف تھا۔ ان تمام کارروائیوں کو ذرائع ابلاغ نے ''سینڈینسٹا کی طرف سے لگائے جانے والے الزامات'' کا نام دیکر نفی کی۔[6]

اس طرح ریگن انتظامیہ نے بین الاقوامی دہشت گردی کا ایک مضبوط جال بُنا جس کی کم از کم میرے علم کی مطابق تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اسے نظریہ ریگن سے مطابقت رکھنے والے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا گیا۔ جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔

ایران۔باغی مقدمے کی سماعت کے بعد اس راز سے پردہ اٹھا کہ ریگن انتظامیہ نے وزیر خارجہ جارج شلز کی حمایت سے ایک منصوبے کی منظوری دی تھی، جس میں باغیوں کی مدد کے سلسلے میں کی جانیوالی کارروائیوں میں جنوبی افریقہ کا نام بھی زیرِ غور تھا۔جنوب میں تعینات ایڈن یا سٹورا کی فوج کو جنوبی افریقہ کی جانب سے دو لاکھ پونڈ مالیت کا اسلحہ بھی فراہم کیا گیا۔سی آئی اے کی فروری 1985ء کی رپورٹ میں اس کا ذکر ملتا ہے، لیکن جب ڈیون کلیرتج، جو کہ باغیوں کو خفیہ امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں سی آئی اے کا انچارج تھا، کی طرف سے ساحلی علاقوں میں سرنگیں بچھانے پر شور وغل بلند کیا گیا تو اس منصوبے پر مزید عملدرآمد روک دیا گیا۔مشہور جریدے ٹائمز نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے''وہ ممالک جہاں انسانی حقوق کے مسائل موجود ہیں یا جو امریکی امداد پر انحصار کرتے ہیں اس قسم کے تعاون کے لئے کبھی بھی انتظامیہ کے زیرغور نہیں رہے۔حکومت نے صرف انہی ملکوں سے امداد کی درخواست کی جہاں انسانی حقوق کا ریکارڈ بہتر ہے، جیسا کہ جنوبی کوریا، سعودی عرب اور سنگاپور یا پھر تائیوان، چین، اسرائیل'' ٹائمز کے معیار کے مطابق ان تمام ممالک میں انسانی حقوق کی ریکارڈ بہت بہتر تھا اور یہ امریکی امداد پر انحصار نہیں کرتے تھے۔[7] یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ خفیہ دہشت گردی پر انحصار عوامی تنقید سے بچنے کے لئے کیا گیا۔ملکی آبادی کو ان کارروائیوں سے لاعلم رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ کبھی بھی اس کی حمایت نہیں کرے گی، اس کے علاوہ ان منصوبوں کو خفیہ رکھنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ہم دیکھیں گے کہ کانگریس اور ذرائع ابلاغ نے سچائی کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ یہ کام تقریباً ناممکن ہو گیا، اس کے باوجود بھی یہ کوشش جاری رہی کہ ان منصوبوں کے بارے میں عوام کو کم سے کم آگاہی ہو، اس طرح کی حکمت عملی''اہم موڑ'' کا جز ولاینفک ہے۔ایسے معاملات میں ریاست کا عوام کو اپنا دشمن گردانا کوئی اچنبے کی بات نہیں، اشراف کے فائدے کے لئے عوام کی آواز کو دبانا یا خاموش کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔شہریوں اور جمہوریت کے خلاف یہ بُغض ریگن انتظامیہ کا خاصہ تھا۔اس کا واضح اظہار کانگریس کے سامنے بیانات کے وقت ہوا۔صورتِ حال اس وقت بہت دلچسپ ہو گئی جب ریپبلک پارٹی کے جیک بروکس کی طرف سے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کرنل نارتھ نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ''قومی بحران کے زمانے میں'' معاشرے میں پائی جانے والی بے چینی یا عوامی مخالفت پر قابو پانے کے لئے آئین کو معطل اور مارشل لاء کا نفاذ کیا جا سکتا ہے۔ان کے خیال کے مطابق

ایسے حالات میں ملک کی بھاگ دوڑ بحران کو حل کرنے والے قومی ادارے FEMA کے سپرد کردینی چاہیے۔FEMA کے اسوقت کے ڈائریکٹر لوئی گیفریڈا تھے جو ریگن اور ایڈون میز کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔1970ء میں فوجی جنگی کالج میں انہوں نے ایک یادداشت تحریر کی تھی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اندرونی انتشار کے دنوں میں تمام حبشیوں کو کیمپوں میں محبوس کردینا چاہیے۔اس موقع پر کانگریس کے چیئرمین ڈینیل اینوئی نے فوری مداخلت کی اور اس قسم کے بہت سے سوالوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والے انکشافات کو کارروائی سے حذف کرنے کا حکم دیدیا۔[8] ذرائع ابلاغ نے بھی اس پر بات کرنے سے اجتناب کیا۔

عوام کا یہی خوف ہے جس کی وجہ سے ریگن دور حکومت میں دہشت گردی کو خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔دہشت گردی کے کلچر کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ تمام اہم حقائق کو دھندلا دیا جائے اور ایسا ہی کیا گیا۔نکاراگوا کے باغیوں کو دوسری گوریلا تحریکوں کے مقابلے میں فوقیت حاصل ہے۔انہیں بھاری امداد، اسلحے کی فراہمی، فوجی تربیت، اطلاعات تک رسائی اور بیرونی ممالک میں جائے پناہ جیسی سہولتیں میسر تھیں۔[9] ایک حقیقی گوریلا تحریک کو (مثلاً ایل سیلواڈور کی گوریلا تحریک) اس امداد کا ایک حصہ بھی فراہم کردیا جاتا تو یہ بہت جلد ایک مضبوط فوجی طاقت کی شکل اختیار کرلیتی اور امریکہ کی قائم کردہ حکومت کا بہت پہلے تختہ الٹ چکا ہوتا۔تاہم نکاراگوا میں گوریلا فوج گاہے بگاہے دہشت گردی کے واقعات سے آگے نہ بڑھ سکی، اس لئے سی آئی اے کو ایک دفعہ پھر مجبوراً علاقے میں اپنے کمانڈو اتارنے پڑے، جیسا کہ اس نے ساحلی علاقوں میں سرنگیں بچھانے اور تیل کی تنصیبات پر حملے کے وقت کیا تھا۔ان کمانڈو کا مقصد نکاراگوا میں تباہی پھیلانا تھا۔ان کارروائیوں کی نگرانی ایل سیلواڈور، ہنڈرس اور نکاراگوا کے ساحل پر موجود امریکی بحری بیڑوں سے کی گئی۔[10] نیویارک ٹائمز نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، ''سی آئی اے باغیوں کیلئے فوجی اہداف کا انتخاب کررہی ہے۔باغیوں کو ڈیموں، شاہراہوں، بجلی گھروں اور ہوائی اڈوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔یہ منصوبے امریکی فوج کی انجینیئر کور اور دوسری امریکی ایجنسیوں نے تعمیر کیے تھے، اب یہی ایجنسیاں امریکی فوجیوں کو حملوں میں مدد کے لئے نقشے اور دستاویز فراہم کررہی ہیں۔[11]

امریکی کمک کے بعد جب موسم بہار میں حملے کا آغاز کیا گیا تو ماہرین نے یہ مشورہ دیا کہ پہلے

پہل آسان اہداف کونشانہ بنایا جائے۔اس مرحلے پر سینڈینسٹا کی فوجوں سے براہِ راست دست و گریباں ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے،امریکہ کی جنوبی کمانڈ کے کمانڈر جنرل جان گلون (John Galvin) نے کانگریس اور میڈیا کے سامنے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا''ہم نے مدبرانہ حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے حملوں کا رُخ شہری آبادی کی طرف موڑ دیا ہے۔یہ اہداف نسبتاً آسان ہیں کیونکہ شہری آبادی کے پاس اپنے دفاع کا کوئی چارہ نہیں ہوتا،اس سے باغیوں کی کامیابی کے امکانات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔'' اسکے کافی عرصے بعد بھی امریکی اور مغربی مبصرین نے لکھا کہ''باغیوں نے ابھی تک نکاراگوا میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کی ہے،ان کے حملے سینڈینسٹا کے دفاعی حصار کو توڑنے میں ناکام رہے ہیں۔انہوں نے ابھی تک پہاڑوں سے نکل کر قصبوں اور شہروں میں اپنی کارروائی کا آغاز نہیں کیا ہے،وہ ابھی تک چھوٹے اور آسان اہداف کونشانہ بنارہے ہیں۔''[12] ریگن کے دور حکومت میں امریکہ نے دہشت گردی کے میدان میں نئی تاریخ رقم کی۔ایک ایسی فوج تیار کی گئی،جس کا مقصد لڑائی کی بجائے دہشت گردی تھا۔اسلحے کی ترسیل کا جدید ترین نظام مرتب کیا گیا اور یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ آسان اور نرم اہداف کونشانہ بنایا جائے تاکہ دشمن کے جسم سے دھیرے دھیرے خون رستا رہے۔اس وقت نکاراگوا بہت کمزور ہو چکا تھا اور اسکے معاشرے کو قائم و دائم رکھنا ایک مشکل کام نظر آتا تھا۔ایل سیلواڈور میں بھی ایک دہشت گرد فوج قائم کی گئی جس کا کام جارحیت سے کام لیتے ہوئے عوام کو دبانا تھا۔کچھ اسی طرح کا کام گوئٹے مالا میں بھی کیا گیا۔یہ پروگرام اپنے بنیادی مقاصد کے حصول میں بہت حد تک کامیاب رہا۔اس لئے اسے کسی نہ کسی صورت میں جاری رہنا چاہیے بے شک ہم نے کسی بھی معاہدے پر دستخط کیئے ہوں۔امید کامل ہے کہ ملک کے اندر بھی کسی خاص تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ ہماری رائے عامہ ذمہ دار ہے اور ہماری نیتیں نیک ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ امریکہ کا دفاعی نظام اور اسکی فوجیں نکاراگوا کیخلاف مسلسل زیرِ استعمال رہیں۔اول الذکر کو امریکہ کے ایٹمی پروگرام کی چھت بھی میسر تھی۔جسے دھمکی اور خوف و ہراس پھیلانے کے لئے استعمال کیا گیا تاکہ جارحیت،تخریب کاری اور دہشت گردی کی پالیسیوں کے خلاف کوئی مداخلت برداشت نہ کرنا پڑے۔[13]

امریکی اخبارات باغی فوجیوں کو گوریلا فوج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔الفاظ کی کسی بھی

تعریف کی رو سے یہ گوریلا فوج نہیں تھی اس نے کبھی بھی کوئی سیاسی پروگرام تشکیل نہیں دیا۔ جن علاقوں میں حکومت کی پالیسیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہاں بھی اپنے حق میں کوئی قابلِ ذکر حمایت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ عوامی حلقوں میں باغی فوجوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کے لئے جو بھی منصوبے بنائے گئے ان میں شوق اور مہارت کی کمی تھی۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تمام کوششیں بے دلی سے کی گئیں۔ اگر نکاراگوا میں گوریلا فوج کا وجود قائم رہا تو اس کا سبب اسلحے کی ترسیل کا جدید نظام اسلحے کی فراوانی اور معلومات تک باآسانی رسائی تھا، اسکی عدم موجودگی میں نکاراگوا میں گوریلا فوج کا نام ونشان تک مٹ گیا ہوتا۔ اس پر ہم بعد میں تفصیلاً بحث کریں گے، لیکن حقائق شک وشبے سے بالاتر ہیں۔ ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کی گئی کہ نکاراگوا اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے وسائل اکٹھے نہ کر سکے۔ نکاراگوا کی بے سروسامانی ہی امریکی سیاسی حلقوں میں واحد قابلِ قبول منظر نامہ تھا۔ پال سون گیس اور کرسٹوفر ڈوڈ جیسے لبرل امن پسند اس خیال سے متفق تھے کہ نکاراگوا کو اپنی علاقائی سالمیت کی حفاظت کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ پال سون گیس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر نکاراگوا کی حکومت جیٹ طیارے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو امریکہ پر لازم ہے کہ وہ اس پر بمباری کردے کیونکہ یہ ''طیارے امریکی سالمیت کے لئے خطرے کی گھنٹی ہیں''۔ یہ ایسے خیالات تھے جن پر بحث کرنا وقت کا ضیاع ہے لیکن یہ امریکہ کے علمی حلقوں میں پائے جانے والے ہسٹیریا پر ضرور روشنی ڈالتے ہیں۔[14]

وسطی امریکہ میں امریکی فوجوں نے براہِ راست جنگی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ اسکی واضح مثال ایل سیلواڈور اور نکاراگوا ہیں۔ ہنڈرس میں امریکی فوجوں کی کاروائی کے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف تو کانگریس کی مرضی کیخلاف ہنڈرس میں امریکی فوجی اڈے قائم کئے گئے، دوسری طرف ان اڈوں کی وجہ سے نکاراگوا کے سر پر مسلسل یہ تلوار لٹکتی رہی کہ امریکی فوج کسی وقت بھی ہنڈرس سے نکاراگوا میں داخل ہو سکتی ہے۔ مئی 1987ء میں جو پچاس ہزار فوجی ہنڈرس میں نکاراگوا کی سرحدوں پر تعینات کئے گئے، وہ ایک خاص حکمتِ عملی کا حصہ تھے، اس کا مقصد نکاراگوا کی فوج کو رہائشی علاقوں سے پرے دھکیلنا تھا تا کہ عوام کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاسکے۔ ایسا کانگریس کو یہ یقین دلانے کے لئے بھی کیا جارہا تھا کہ فوجی کارروائیاں کامیابی سے جاری ہیں اور دہشت گردوں کی امداد جاری رہنی چاہیے۔

جب کسی امریکی حلیف ملک کو دھمکی سے مرعوب کر کے جنگ کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو ہم

اسے جارحیت کا نام دیتے ہیں اور اپنے دفاع کی خاطر جوابی حملے کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب عرب ممالک نے مئی 1967ء میں اسرائیلی سرحدوں پر فوجیں تعینات کر دیں تو امریکہ اور اہلِ مغرب میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اسرائیل اپنی سرحدوں پر اس صورتِ حال کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اسلئے اسرائیلی حملے کو جائز قرار دیا گیا۔ یہاں خیال رہے کہ اسرائیل کوئی مفلس اور تہی دست ملک نہ تھا جسے کسی بڑی طاقت کے حملے کا سامنا ہو۔ اب نکاراگوا کے معاملے پر غور کیجئے جب امریکی جنگی مشینری نے نکاراگوا کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلسل حالتِ جنگ میں رہے تو چاروناچار اُسے شہری آبادی کی حفاظت کے لئے تعینات فوج کو سرحدوں پر بلانا پڑا، اس عمل نے دہشت گردوں کے لئے عوام پر حملے کی راہ ہموار کی۔ میڈیا نے اس سلسلے میں مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی، البتہ نکاراگوا کو سوویت یونین سے ہتھیار حاصل کرنے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ کے لئے یہ ثبوت کافی تھا کہ نکاراگوا میں سوویت کٹھ پتلی حکومت قائم ہے جو ''ہمارے معاشرے کے لئے زبردست خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔'' اگرچہ نکاراگوا میں مرنے والوں کی تعداد ایل سیلواڈور اور گوئٹے مالا کی نسبت بہت کم تھی تاہم نکاراگوا کو نظریہ ریگن کی ایک بہت بڑی کامیابی خیال کیا جاتا ہے، اس کامیابی کو اس وقت شایانِ شان طریقے سے منایا گیا، جب نکاراگوا میں متعدی بیماریوں کا شکار ہو کر ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن رہے تھے۔ سینڈینسٹا کے اقدام کی وجہ سے یہ بیماریاں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ لیکن اب درآمدات پر پابندی اور حلیفوں اور بین الاقوامی اداروں پر مسلسل امریکی دباؤ کی وجہ سے معاشی بدحالی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ ناخواندگی کا گراف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس دور کی ایک رپورٹ کے مطابق صحت کے شعبے میں کئے گئے اقدامات کی وجہ سے بچوں کی شرح اموات میں ڈرامائی انداز میں کمی آئی تھی۔ لیکن اب حالات ابتر ہوتے جا رہے تھے، کیونکہ حکومت کو اپنے وسائل جنگ کی بھٹی میں جھونکنے پڑ رہے تھے۔ دوسری طرف دہشت گردوں کا ہدف زیادہ تر سکول اور ہسپتال ہی ہوتے ہیں، ان پر حملہ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اب تک کوئی 60 کے قریب مراکزِ صحت تباہ کئے جا چکے ہیں اور بیشتر عملے کو اغوا یا قتل کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک گاؤں میں 150 بچے چیچک کی وجہ سے چل بسے، کیونکہ باغیوں نے طبی عملے کو اس گاؤں تک پہنچنے نہیں دیا۔ تپ دِق اور دوسری بیماریاں پھر سے سر اٹھا رہی ہیں۔ ہسپتال دواؤں اور آلات کی کمی کا شکار ہیں۔ غذا کی کمی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر امریکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گیا تو صورتِ حال

مزید خراب ہوسکتی ہے۔شیر خوار بچوں میں شرح اموات جو کہ سینڈینسٹا کی اصلاحات کی وجہ سے نصف رہ گئی تھی ۔اب دوبارہ بڑھ رہی ہے۔ہسپتال جو کہ پہلے صرف امراء کے علاج کے لئے وقف تھے اور جنہیں سینڈینسٹا نے عوام کے لیے کھول دیا تھا اب ایک ایک کر کے بند ہو رہے ہیں۔اسی طرح اساتذہ کی تعداد میں تین گنا اضافے کے باوجود سہولیات کا فقدان ہے۔واشنگٹن پوسٹ کی ایک سُرخی کے مطابق ''باغیوں نے اس جگہ وار کرنا سیکھ لیا ہے۔جہاں زیادہ درد ہوتا ہے'' خبر کے مطابق باغیوں کے حوصلے بلند ہیں اور انہیں سی آئی اے کی مکمل امداد و حمایت حاصل ہے۔اس رپورٹ میں اس واقعہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح باغیوں نے پٹاسی جیسے دور دراز گاؤں میں چرچ کی مدد سے چلنے والے ایک ہسپتال کو آگ لگائی۔باغیوں کے گروہ FDN نے فخریہ انداز سے ذکر کرتے ہوئے اسے ایک ''اہم کارروائی'' قرار دیا۔[15]

یہ سب امریکہ کی ان کوششوں کے نتائج تھے، جو اس نے نکاراگوا کو ذلت کی گہرائیوں میں دھکیلنے کے لئے کیے۔پول پوٹ کے جرائم کا احاطہ کرتے ہوئے ہم صرف ان لوگوں کو شمار نہیں کرتے، جو قتل کر دیئے گئے بلکہ انہیں بھی گنتے ہیں جو بیماریوں، غذا کی کمی اور سخت ترین حالات کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکے۔سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک اندازے کے مطابق بیماریوں، غذا کی کمی دوسری وجوہات کے باعث لاکھوں نہیں تو ہزاروں ضرور لوگ لقمہ اجل بنے[16] لیکن اہل الرائے نظریہ ریگن کو کبھی بھی انسانی جانوں کے ضیاع کے حوالے سے نہیں پرکھیں گے۔امریکی جرائم کی کہانیوں نے سوویت حلقوں کو بھی حیرت زدہ کر دیا، ان کے خیال میں ان کے اپنے ملک میں ہونے والے ریاستی جرائم کے پیچھے نیک مقاصد کارفرما تھے جو اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ایسا کوئی تقابلی جائزہ انصاف کے تقاضوں پر پورا نہیں اُترتا دیکھا کیونکہ سوویت ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے ہاں تشدد کی بنیاد خوف تھی۔سینڈینسٹا حکومت نے وسائل کا دھارا غرباء کی طرف موڑنے کی جو مجرمانہ غلطی کی تھی اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔یہ اس عہد کی وضاحت کرتا ہے جو ریگن حکومت نے سینڈینسٹا کا تختہ اُلٹنے یا پھر خطے میں اسے مقام عبرت بنانے کے لئے کیا تھا۔[17] اب ہم عوام کے مصائب و آلام پر اظہار مسرت کر سکتے ہیں۔نیویارک ٹائمز کے خیال میں ''امریکہ کے جیالوں نے نکاراگوا کے آلام کو سرحد پار کرنے سے روکے رکھا۔''[18]

جب امریکہ نے جنوبی ویت نام کی دیہی آبادی کے خلاف دہشت گردی کا آغاز کیا تو در پردہ ایسی ہی سوچ کارفرما تھی۔ صدر کینیڈی اور صدر جانسن کے مشیر میکسویل ٹیلر نے کانگریس میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہمارا مقصد یہ دکھانا تھا کہ جنگِ آزادی مہنگی اور خطرناک ہوتی ہے اور کامیابی کے امکانات موہوم ہیں"[19] اسی طرح اپنے محسنین کی طرف سے قائم کردہ بین الاقوامی نظام کو تبدیل کرنا بھی آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے، یہی وہ خیالات ہیں جن کا ذکر ونسٹن چرچل نے کیا تھا اور جس کا ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔ "وہ افراد جو بہت سکون سے اپنے گھروں میں رہائش پذیر ہیں" اور جنہیں اپنے "اعلیٰ مقام کی وجہ سے دنیا کی حکمرانی کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔" یہی وجہ اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ ریگن انتظامیہ کی کارروائیوں کو کیوں مقتدرہ کی حمایت حاصل تھی؟ اور ثقافتی دھارے میں ایک سادہ سے سچ کا اظہار بھی اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟ ماضی میں نکاراگوا کے عوام نے بہت سی مصائب اور تکالیف کا سامنا کیا تھا۔ اب ہم انہیں دوبارہ اسی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یہ موضوعات علمی حلقوں میں کبھی بھی زیرِ بحث نہ آسکیں گے۔ اس طرح ہنڈرس اور دوسرے علاقوں کے حالات بھی کسی کے لئے دلچسپی نہیں ہوں گے۔ وسطی امریکہ کے ممالک نے پچھلی ایک صدی کے امریکی تسلط کے اثرات کو باعثِ زائل کرنے کی کوشش کی، اس امریکی تسلط نے خوف اور نفرت کے جذبات کو جنم دیا جسے کمیونزم کی مخالفت کے پردے میں چھپایا جاتا رہا اس کے علاوہ امریکہ نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ نکاراگوا کو ضرور "وسطی امریکہ کے دھارے" میں واپس لائے گا۔ یہ الفاظ واشنگٹن پوسٹ نے استعمال کیے تھے جس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ دہشت گردوں کو آسان اہداف کو نشانہ بنانے کا حکم دیا گیا۔ اس کا مقصد واضح تھا۔ سینڈینسٹا حکومت کا خیال تھا کہ وہ وسائل کی کمی کے باوجود اس قسم کی اصلاحات نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی جو ہمسایہ ممالک کے لئے کشش کا باعث ہوں گی۔ نکاراگوا کے دیہی علاقوں میں جہاں سوموزہ حکومت کے لیے تھوڑی بہت حمایت پائی جاتی تھی ایسے اقدام بہت ضروری تھے۔ دوسری طرف ان اصلاحات کی کامیابی کے خوف سے بچنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مراکز صحت، سکولوں اور امداد باہمی کے تحت قائم کئے جانے والے کھیتی باڑی کے نظام کو تباہ کیا جائے یہی وجہ تھی کہ باغی فوجوں کو ایسے "آسان اہداف" پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ دور دراز علاقوں میں جہاں دہشت گرد بلا روک ٹوک اپنی کارروائیاں کر سکتے تھے اس پالیسی کو کسی حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ پیٹر فورڈ کی اطلاع کے مطابق

ہنڈرس کی سرحد سے ملحقہ صوبہ جینوٹیگا میں دہشت گرد شہریوں کو ہراساں کرنے اور بہت سے ڈاکٹروں اور اساتذہ کو قتل کرنے میں کامیاب رہے۔ ان واقعات نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ سکولوں اور ہسپتالوں کو بند کر دے، گھروں، گوداموں اور کھڑی فصلوں کو آگ لگانے کے واقعات عام تھے۔ کسانوں کے لئے منافع تو دور کی بات اپنا پیٹ پالنا بھی مشکل ہو گیا۔ ایک کسان خاتون کے الفاظ میں باغی رہنماؤں نے لوگوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ''سو دفعہ اپنے گھر تعمیر کریں گے تو اسے سو دفعہ تباہ کر دیا جائے گا۔''[20] یہ سب کچھ اس سازش کے تحت کیا گیا کہ قومی سالمیت اور اصلاحات کی کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے۔ خیال تھا کہ اس سے معاشرے میں بے چینی بڑھے گی اور لوگ آخر کار خود ہی اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ دہشت گردی کا خاتمہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عوام امریکہ کے آگے سر جھکا دیں۔

امریکی دہشت گردی کے حامیوں نے نظریہ ریگن میں موجود نقائص پر پردہ ڈالنے کے لئے الفاظ کا خاص ذخیرہ تیار کیا ہے۔ نیو ریپبلک کے مدیر مارٹن کونڈریک خبردار کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنا راستہ بدلا تو جمہوریت کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔[21] تاہم چارلس لین جو کہ لبرل خیالات کے حامی سمجھے جاتے ہیں اسی جریدے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''امریکہ کی خواہش تیسری دنیا میں جمہوریت کا فروغ ہے اور یہ ویت نام میں ہونے والی رسوائی کو مٹانے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔'' وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ ''ممکن ہے یہ نظریہ سیلواڈور میں کامیاب رہا ہو لیکن نکاراگوا میں امریکہ کی بے صبری نے اسے نقصان پہنچایا۔ یہاں امریکہ کا سامنا ایک ایسے معاشرے اور ثقافت سے تھا جسے باآسانی جمہوری قدروں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا تھا''۔ ناقدین کا خیال ہے کہ ریگن انتظامیہ کی جمہوریت کے لئے کوششیں شاید کچھ زیادہ ہی جارحانہ تھیں (جان ریلی) سینڈینسٹا انقلاب کو امریکی جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش اتنی منافع بخش نہیں تھی جس کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا جاتا (جان اُوکس) نکاراگوا ہماری نیک خواہشات کے دائرے سے باہر بستا ہے۔ (جیمز مارلے)[22] لین، اوکس اور مارلے صحافت کے میدان میں اختلاف رائے کی بیرونی حدود پر کھڑے ہیں ان سے پرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ویت نام میں جمہوریت کی بحالی میں شرکت کرنے والی ''پہلی جماعت'' کو نشانہ تنقید بنانے کی کوشش کی تھی۔[23]

وسطی امریکہ کے لئے ہماری نیک خواہشات اپنی جگہ پر مسلم ہیں۔ تاریخی حقائق بھی اس کا

کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہی حال جنوب مشرقی ایشیا، افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کا ہے۔ دہشت گردی کے ماحول میں تاریخی ریکارڈ ویسے بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ ساری تنقید بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے اور یہاں ہر دلعزیز نظریہ صرف ''راستے کی تبدیلی'' کا ہوتا ہے۔ حالیہ سالوں میں وسطی امریکہ میں ظلم و ستم کی جو داستانیں رقم کی ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو ہماری نیک خواہشات کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔'' اسی قسم کے ردِعمل کا ہمیں جنوبی کوریا میں بھی سامنا کرنا پڑا جب وہاں کے حکمرانوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج اس مقام پر پہنچ گئی جسے نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ ظلم و ستم گذشتہ کئی سالوں سے امریکی مدد سے جاری تھے۔ اسکے نتیجے میں پیدا ہونے والے امریکہ مخالف جذبات عکاسی کرتے ہیں کہ امریکی اخلاقیات کو دوسرے ممالک کے سیاسی عمل پر ٹھونسنا ایک دشوار گزار مرحلہ ہو گا۔[24]

''نیک خواہشات'' کے نظریے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جب دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکہ، برطانیہ کی روایتی جگہ لینے کی کوشش کر رہا تھا، تو برطانوی دفتر خارجہ نے ان امریکی سازشوں کو بھانپ لیا تھا۔ زمانہ جنگ کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ ''مشرقِ بعید میں امریکہ کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں'' اور دوسرے بہت سے مقامات پر وہ برطانیہ کو'' میدان سے باہر دھکیل رہا ہے'' برطانوی 'راج' کے سفیروں نے حکومت کو خبر دار کیا کہ ''امریکہ اپنے معاشی نو آبادیاتی نظام کو بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا رہا ہے اور اس پروگرام پر بین الاقوامیت کا پردہ اوڑھا گیا ہے۔'' برطانوی وزیرِ خارجہ نے اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے کہا، ''اس دنیا میں امریکہ کے کچھ مقاصد ہیں اور وہ ان مقاصد کو پورا کرے گا۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا کو اس کی ضرورت ہے اور دنیا میں اس کے کردار کو پسند کیا جائے گا۔ مختصراً یہ کہ دنیا کو اسے برداشت کرنا پڑے گا، چاہے وہ اسے پسند کرے یا ناپسند۔''[25] امریکی خارجہ پالیسی اور اس کی دھوکا دہی پر یہ ایک مختصر مگر جامع تبصرہ ہے۔ ایسی بصیرت کم و بیش تمام مصیبت زدوں نے حاصل کر لی تھی۔ ان میں برطانوی راج بھی شامل تھا، جسے امریکی معاشی نظام کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی، امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے بے یار و مددگار کسان بھی تھے جنہیں امریکی غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑا اور یورپ کے وہ کارکنان بھی تھے، جنہیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکی سرمایہ داروں اور ان کے مقامی اتحادیوں کیلئے سرمایہ داری نظام کی تعمیرِ نو کی قیمت چکانا پڑی۔ یہ علمی حلقوں کا کام تھا کہ وہ حقائق پر پردہ ڈالیں اور یہ کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ بیرونی دنیا پر قابو پانا ایک مشکل کام تھا۔ ریگن

انتظامیہ کو ابتدا ہی سے امریکہ اور باقی دنیا کے درمیان خلیج پیدا کرنے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ قدامت پسند حلقے بھی اس سلسلے میں ہم آواز تھے۔ کینیڈا کے سرکردہ اخباروں نے جو کہ عام طور پر امریکہ کے حامی ہوتے ہیں۔ ریگن انتظامیہ کی مذمت کی اور وحشت و بربریت کی کارروائیوں کو ''پاگل پن'' قرار دیا جو کہ واشنگٹن کے ''نیم پاگل کاؤبوائے رہنما'' کی ہدایت پر کی جا رہی ہیں۔ جب امریکہ 1987 کے معاہدے کی جڑیں کاٹنے کی تیاری کر رہا تھا تو برطانوی پریس نے صدر ریگن سے درخواست کی کہ وہ وسطی امریکہ میں ''حقیقت سے سمجھوتہ کرے'' اور ''نکاراگوا کی حکومت کا تختہ الٹنے کے جوش میں قاتلوں اور باغیوں کے ٹولے کی حمایت کرنے کی بجائے منصوبہ امن کو کامیاب بنائے'' یہ ایک ایسا جہاد ہے جو ریگن اور اسکی انتظامیہ کے لئے ذلت کا باعث بن رہا ہے۔''

''لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور کروڑوں پونڈ کی املاک تباہ ہو چکی ہیں۔ واشنگٹن کے تمام تر پراپیگنڈہ کے باوجود بین الاقوامی طور پر امریکہ کو شکست خوردہ اور سینڈینسٹا کو وسطی امریکہ کی مقبول ترین حکومت تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سوویت یونین سے نکاراگوا کے تعلقات اتنے کمزور ہیں کہ گورباچوف نے اسے تیل کی فراہمی بند کر دی ہے۔ وہ ملک جو اپنے آپ کو دنیا کی عظیم ترین جمہوریت کہلاتا ہے۔ گوئٹے مالا، ہنڈرس اور ایل سیلواڈور کے ظالموں کے ساتھ اتحاد قائم کر رہا ہے۔ ریپبلکن پارٹی کا نشان ہمیشہ سے ہاتھی رہا ہے، یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ اسکی حرکتیں مچھروں جیسی ہیں۔''[26]

ایسے خیالات کا اظہار ہمیں قومی سطح کے جرائد میں ہی ملتا ہے، نچلی سطح پر اسکی مثالیں ملنا مشکل ہیں۔ حلیف ممالک کے کچھ جرائد نے ریگن کے ''پاگل پن'' پر اظہار ہمدردی بھی کیا ہے[27]

جہاں بین الاقوامی دہشت گردی کی کارروائیاں مسائل کو جنم دیتی ہیں وہاں کچھ تلافی کے مواقع بھی فراہم کرتی ہیں۔ حکومت کے منتظمین اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ بیرونِ ملک امریکہ کی کیا تصویر پیش کر رہے ہیں اور وہ اسے دہشت گردی کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اپریل 1986ء میں لیبیا پر بمباری کے کچھ ہفتوں بعد انتظامیہ نے مغربی طاقتوں کو لیبیا کے خلاف جہاد میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، اپنے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہوں

نے ٹوکیو سربراہی کانفرنس کے دوران ایک پیپر شائع کیا جس میں دنیا کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ ''اس سلسلے میں مناسب قدم اٹھائیں تا کہ مخبوط الحواس امریکی دوبارہ مسئلے کو اپنے ہاتھوں میں نہ لے لیں'' یہ چال کامیاب رہی اور ریگن کے مشیر اس کامیابی کی وجہ جانتے تھے۔

ایک امریکی سرکاری نمائندے نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''پاگل پن والا عنصر ہمارے حق میں کام کر رہا ہے،'' اس کا اشارہ قذافی کی طرف نہیں بلکہ ریگن کی طرف تھا۔[28]

مبصرین اور ذرائع ابلاغ اس بات پر مُصر ہیں کہ سینڈینسٹا حکام حملے اور مداخلت کے خطرے کو بہانہ بنا کر ملک کے اندر ظلم وستم اور معاشی بدحالی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ سب کچھ ان کی نا اہلی اور شیطانی فطرت کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ان دعووں کو ثابت کرنے کے لئے ٹھوس حقائق یا عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ سب پراپیگنڈہ کی ضرورت کے تحت کیا جا رہا ہے۔ ہمیں ایل سیلواڈور جیسے ممالک کی مثال کبھی بھی پیش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کے نتائج ہمارے حق میں نہیں ہوں گے۔ امریکہ اور اسرائیل جیسے ممالک میں گو کہ حالات اتنے سنگین نہیں ہیں تاہم یہاں بھی ہمیں ریکارڈ کو دبا دینا چاہیے۔[29] مبصرین کو معاشی کارکردگی کے بارے میں حقائق کو بھی رد کرنا پڑے گا۔ امریکی ترقیاتی بنک کے 1983ء کے نتائج کے مطابق ''نکاراگوا نے سماجی شعبے میں قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ جو کہ طویل مدتی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے بنیاد فراہم کرے گی۔'' اس قسم کی آراء آکسفام جیسی بین الاقوامی امدادی ایجنسیوں کی بھی تھیں، یہاں اس حقیقت کے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کی 1980ء سے 1985ء کے دوران مجموعی قومی پیداوار میں ترقی کا تناسب 4.4 فیصد رہا جو کہ لاطینی امریکہ کی مجموعی پیداوار سے تقریباً دوگنا تھی۔ ترقی کی یہ شرح لاطینی امریکہ کا کوئی دوسرا ملک حاصل نہ کر پایا۔ یہاں ہمیں فلاح و بہبود کے کاموں اور زرعی شعبے میں بے پناہ سرمایہ کاری کی قدر کو بھی کم کرنا پڑے گا۔ زرعی شعبے میں ترقی کا یہ عالم تھا کہ نکاراگوا کے خوراک میں خود کفیل ہونے کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس سلسلے میں دوسرے ممالک کی کارکردگی مایوس کن رہی۔ گوئٹے مالا (57 فیصد) اور کوسٹاریکا (73 فیصد) کو زرعی شعبے میں سرمایہ کاری کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ برآمدات کے اہداف پر نظر دوڑانا بھی مناسب نہ ہو گا۔ نکاراگوا میں 1979ء سے 1985ء کے دوران برآمدات میں 11 فیصد اضافہ ہوا۔ اسکے مقابلے میں وسطی امریکہ کی مجموعی برآمدات میں 19 فیصد کمی واقع ہوئی ۔ یہاں ہمیں نکاراگوا کی کونسل فار

پرائیویٹ انٹر پرائز کے چیئر مین این ریک بولینوس (Enrique Bolanos) کے مرتب کردہ ان نتائج پر پردہ ڈالنا پڑے گا جس کے مطابق نکاراگوا کی معاشی بدحالی میں جنگ کا حصہ 60 فیصد، عالمی کساد بازاری 10 فیصد وسطی امریکہ کی مشترکہ منڈی میں سکڑاؤ 10 فیصد اور حکومتی غلطیوں کا حصہ 20 فیصد ہے۔[30] یہ خیال رہے کہ این ریک بولینوس سینڈینسٹا حکومت کے سرکردہ مخالفین میں سے تھا۔ سوموزہ حکومت کے خاتمے کے بعد حاصل کی گئی نا قابلِ یقین کامیابیوں کو بھلانا بھی ضروری ہے۔ جب سینڈینسٹا نے حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھالی تو ہر طرف ابتری کا دور دورہ تھا۔ اکتوبر 1980ء میں عالمی بنک کی ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق نکاراگوا میں ''فی کس آمدنی 1977ء میں جس مقام پر تھی وہ 1980ء کی دہائی کے اختتام تک کسی صورت میں بھی حاصل نہیں کی جاسکتی چاہے حالات کتنے سازگار کیوں نہ ہو جائیں''[31] جب کہ بہتری کی بات تو دور، امریکی جنگ کی شدت میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا اور اپنے وسائل کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا شاید کسی خوشحال ملک کیلئے بھی ممکن نہ ہوتا۔

نکاراگوا کے مسائل کا اصل سبب امریکہ ہی تھا۔ اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سینڈینسٹا کے مارکس اِزم کی طرف جھکاؤ اور اسکے نتائج کا بغور مشاہدہ ہمیں دہشت گردی کے کلچر کو ایک اور زاویے سے پرکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے وال سٹریٹ جرنل میں کلیفرڈ کروس (Clifford Krauss) کے ایک مضمون پر غور کیجئے، جو کچھ اس طرح ہے۔ ''نکاراگوا کو اپنی پیدا کردہ معاشی بدحالی پر قابو پانے کیلئے بہت کم امداد میسر ہے۔''[32] کروس اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ کہ جنگ نے حکومت کی معاشی حالت میں تناؤ پیدا کر دیا ہے لیکن وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ تجارت پر پابندی اور اس قسم کے دوسرے امریکی اقدام اس پر کسی صورت میں اثر انداز ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کہنا حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے کے مترادف ہے ان اقدام کی وجہ سے نکاراگوا پر امریکی منڈیوں کے راستے بند ہو گئے اور اسے مجبوراً سوویت یونین پر انحصار کرنا پڑا۔[33] کروس کے خیال میں اصل مسئلہ نکاراگوا کی غیر منافع بخش تجارتی پالیسیاں ہیں، جنہوں نے عالمی منڈی میں نکاراگوا کے لئے مشکلات پیدا کیں۔ اس سلسلے میں وہ کیلے کی قیمت کا حوالہ دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اقدام غرباء تک خوراک کی رسائی کو ممکن بنانے کے لئے اٹھائے گئے۔ اس تنقید کو ایک لمحے کیلئے جائز تسلیم کیجئے اور امریکہ کے زیرِ اثر دوسرے ممالک میں کوئی ایک ایسی مثال تلاش کیجئے جہاں تجارتی

پالیسیاں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ ہنڈرس کو دیکھئے، جو خوراک برآمد کرتا ہے۔ جبکہ اسکی اپنی آبادی فاقوں مر رہی ہے۔ دراصل یہ مارکیٹ کے قدرتی عوامل ہیں جنہیں امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کی جانب سے قبولیت کی سند حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہنڈرس کے کسانوں کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔

ہم نکاراگوا کے مارکس اِزم کی طرف جھکاؤ اور اسکے نتیجے میں پیدا ہونیوالی معاشی ابتری کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہمیں اس کا موازنہ دنیا کے سب سے امیر اور طاقتور ملک سے نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں ریگن کے ذہین وفطین معاشی منتظمین کا پول اکتوبر 1986ء میں شعبہ تجارت کی رپورٹ نے کھولا، جس کے مطابق ’’بہت کم عرصے میں ایک قرضہ دینے والا ملک، قرضہ لینے والا ملک بن گیا بین الاقوامی تجارت میں امریکہ مقابلہ کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔‘‘[34] امریکہ کو 150 بلین ڈالر کا قرضہ دینے والا ملک بننے میں 70 سال کا طویل عرصہ لگا۔ یہ مقام اس نے 1986ء میں حاصل کیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس پر 250 بلین ڈالر کا قرضہ ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ قرضہ 1990ء کے اختتام تک 800 بلین ڈالر تک جا پہنچے گا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایک دہائی میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو ایک ٹریلین ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑیگا۔ عالمی منظرنامے میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ آئی ایم ایف (IMF) کے مطابق عالمی معیشت کو سب سے بڑا خطرہ، امریکی بجٹ کے حجم اور اس کے تجارتی خسارے سے ہے، جو اس کے خیال میں عالمی معیشت کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔[35] ریگن دورِ حکومت کی مایوس کن کارکردگی کا یہ صرف ایک رُخ ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم نکاراگوا کی معاشی ناکامیوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ ریگن کے معاشی منتظمین کے جرائم کی شدت کو کم کرنے کے لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ امریکہ اور تیسری دنیا کا مظلوم عوام کے درمیان حائل وسیع خلیج کو کم کرنے پر تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ابتری جو تیسری دنیا کے خاصہ تھی امریکی معاشرے اور رہن سہن میں بھی جھلکنے لگی۔ دیہاتی بچوں میں پائی جانے والی گلہڑ اور دانتوں کی بیماریاں یہ ثابت کرتی ہیں کہ انہیں مناسب خوراک نہیں مل رہی ہے۔ کناس کے لوگوں کو غذا اور غذائیت کی کمی کا سامنا ہے، ممکن ہے کہ شہری علاقوں کیلئے یہ مسئلہ نیا نہ ہو، لیکن ریگن کے دور میں یہ بدترین شکل اختیار کر گیا۔ ماہرین کے مطابق کسان آج جس بدترین دور سے گزر رہے ہیں اس کی مثال 1929ء کی کساد بازاری کے دوران بھی نہیں ملتی۔ اسکی وجہ کارکردگی کو بڑھانے کے لئے اختیار کیے جانے والے جدید رویے ہیں۔ جہاں

کسان مکئی اور گندم تو اپنے کھیت میں پیدا کرتا ہے لیکن اپنی خوراک خریدنے کیلئے اُسے سپر مارکیٹ جانا پڑتا ہے۔[36] یہاں ایک اہم مسئلہ تیسری دنیا میں ''قرضے کا بحران'' ہے۔ 1981ء تک حالت یہ ہوگئی تھی کہ قرضوں پر سود اصل رقم سے تجاوز کر گیا تھا۔ سود کی شکل میں سرمایہ بیرونِ ملک منتقل ہو رہا تھا۔ لاطینی امریکہ میں صورتِ حال مایوس کن تھی۔ سرمائے کے بیرونِ ملک بہاؤ میں تیزی آ رہی تھی۔ اس طرح ''غریب ممالک سے امیر ممالک کی جانب وسائل جتنی تیزی سے منتقل ہوئے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی''۔[37] اہل الرائے نے وسائل کے اس انتقال اور اسکے سلسلے میں پیدا ہونے والے ممکنہ نتائج کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

عوامی رائے اور کانگریس کی ہدایات کے خلاف ریگن انتظامیہ کی ''خفیہ سرگرمیاں'' کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ صحافیوں کو بہت پہلے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نکاراگوا میں باغیوں کو اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے، لندن کے جریدے سپیکٹیٹر نے 1986ء کے ''سکینڈل'' منظرِ عام پر آنے کے بعد اس طرف اشارہ بھی کیا۔[38] نکاراگوا کی حکومت کی طرف سے اس بارے میں تفصیلات بھی فراہم کر دی گئی تھیں لیکن 1982ء میں ایوجن حیسن فوس (Eugene Hasenfus)* کے گرفتار کئے جانے تک کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس طرح اخباری رپورٹروں نے ان اطلاعات کو کوئی اہمیت نہ دی کہ اولیور نارتھ نیشنل سیکیورٹی کونسل میں واقع اپنے دفتر سے باغیوں کی تمام کارروائیوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ نارتھ کا کردار بالکل واضح تھا لیکن اس پر پردہ ڈالا گیا۔[39] سکینڈل کے منظرِ عام پر آنے سے ایک سال پہلے نیویارک ٹائمز نے یہ خبر دی کہ ''باغیوں کو براہِ راست وائٹ ہاؤس سے مشاورت فراہم کی جا رہی ہے۔'' یہاں اشارہ اولیور نارتھ کی طرف تھا۔ اخبار کے مطابق اس کا نام شائع نہیں کیا گیا کیونکہ یہ اسکی زندگی کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے کچھ عرصہ بعد وائٹ ہاؤس میں منعقدہ پریس کانفرنس میں صحافیوں نے پندرہ مختلف موضوعات پر چھبیس سوالات پوچھے لیکن مذکورہ بالا خبروں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی۔[40]

---

* ایوجن حسینفوس (Eugene Hasenfus) ایک امریکی باشندہ تھا جو سی آئی اے کے لئے کام کرتا تھا۔ 6 اکتوبر 1986ء کو باغیوں کو اسلحہ پہنچانے کی ایک مہم کے دوران نکاراگوا کے فوجیوں نے اس کا جہاز مار گرایا۔ عملے کے باقی ارکان مارے گئے اور حیسن فس کو گرفتار کر لیا گیا، اس نے بعد میں اعتراف کیا کہ وہ سی آئی اے کے لئے کام کرتا ہے۔ تاہم ریگن انتظامیہ نے اس سارے معاملے پر لاعلمی کا اظہار کیا۔ (مترجم)

یہ بھی واضح ہے کہ امریکی حلیف ممالک جن میں ایل سیواڈور، ہنڈرس اور اسرائیل شامل تھے۔ باغیوں کو اسلحہ فراہم کررہے تھے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ امریکی اسلحہ بالواسطہ طریقے سے نکاراگوا پہنچ رہا تھا۔ یہ سب کچھ کانگریس کی ہدایات کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ [41] سکینڈل کا آتش فشاں پھٹنے سے بہت پہلے ہی باغیوں کو اسلحہ کی فراہمی میں سی آئی اے کا کردار واضح ہو چکا تھا۔ جس نے مبصرین کو ہکا بکا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں فوجی کارروائیوں کے لئے فنڈ اور ہنڈرس اور کوسٹاریکا کے سرکاری ملازمین کو رشوت شامل ہے۔ [42] افشائے راز کے یہ واقعات بہت کم توجہ حاصل کر سکے۔

یہ حقائق سب پر واضح تھے لیکن ان پر پردہ ڈالا گیا۔ ایران کے معاملے میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی جس پر ہم تھوڑی دیر کے بعد بات کریں گے۔ 87-1986ء کے واقعات سے جو واحد حیران کن بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ دونوں خفیہ کارروائیاں آپس میں منسلک تھیں۔ ریگن کے زمانے میں دہشت گردی کا جو جال بُنا گیا اس کی تفصیلات کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن یہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گی۔ لاؤس اور کمبوڈیا میں لڑی جانیوالی خفیہ جنگوں میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ یہاں بھی ذرائع ابلاغ کو اس بارے میں تمام تر معلومات حاصل تھیں لیکن ان پر بات نہیں کی گئی۔ [43]

یہ بات بڑی حد تک عیاں ہے کہ اگر کانگریس جنگ میں براہِ راست شمولیت کی اجازت نہ بھی دیتی تو لاقانون انتظامیہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دوسرے ذرائع تلاش کر لیتی۔ ذرائع ابلاغ کانگریس اور دہشت گرد تمام اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی لئے جوناس سارمی نے 1986ء میں صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ''امریکہ جیسے عظیم ملک کے لئے دوسرے ذرائع بھی موجود ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔کلارک ترمیم [44]

وہ لوگ جو از خود نتائج اخذ نہیں کر سکتے وہ رہنمائی کے لئے ریگن انتظامیہ کے ذرائع سے رابطہ کریں۔ میامی ہیرلڈ نے اپنی 9 مارچ 1986ء کی اشاعت میں اس خبر کو سرورق پر جگہ دی جس میں ریگن نے کانگریس سے درخواست کی تھی کہ باغیوں کو امداد اور سی آئی اے کو جنگ میں براہِ راست شرکت کی اجازت دی جائے، ''سرکاری ذرائع کے مطابق اگر کانگریس اس درخواست کو رد کر دیتی ہے تو ریگن کو یہ اجازت ہے کہ وہ نکاراگوا پر قابو پانے کیلئے دوسرے ذرائع استعمال کرے''۔ [45] جب سکینڈل پر پردہ ڈالنا ناممکن ہو گیا تو پریس نے ایک سرکاری اہل کار کا، جو خفیہ جنگ کی نگرانی پر مامور تھا۔ حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''قانون کی پیروی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ تھی

ہمیں ہرصورت میں اپنے مقاصد حاصل کرنا تھے۔'' اس نے مزید کہا،'' حیرانی کی اصل بات یہ ہے کہ کانگریس اور عوام نے ان قابلِ اعتراض کارروائیوں اور قانون شکنی کا نوٹس لینے میں اتنے سال کیوں لگا دیئے، جبکہ آغاز ہی سے یہ بات ہر کسی کے علم میں تھی کہ باغیوں کو امداد دی جا رہی ہے۔''[46] یہاں سب سے اہم سوال بھی یہی ہے جو کہ ابھی تک نہیں اٹھایا گیا'' ذرائع ابلاغ نے اتنے لمبے عرصے تک چپ کیوں سادھے رکھی جبکہ حقیقتِ حال سب پر عیاں تھی؟'' حقیقت کے بارے میں اور بھی بہت سے واضح اشارے موجود تھے لیکن ان سے بے اعتنائی ہی معقول بات ہے جیسا کہ محکومیت کا طریقہ کار ہوتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی نظر اندازی کے باوجود امریکی انٹیلی جنس بلا شبہ باغیوں کو اسلحے کی فراہمی کیلئے روانہ ہونے والی پروازوں سے باخبر تھی۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ان پروازوں کے انتظام میں کوئی امریکی ایجنسی ملوث نہیں تھی لیکن عقل یہ بات ماننے سے انکاری ہے کہ امریکی انٹیلی جنس اتنی نا اہل ہوگئی کہ اسے ایل سیلواڈور اور ہنڈرس میں قائم امریکی فوجی اڈوں سے اڑنے والی پروازوں کا کوئی علم نہ تھا۔ فضائی نگرانی کے لحاظ سے یہ شاید دنیا کا سب سے اہم علاقہ ہے۔ یہ سب باتیں ایلیٹ ابرامز (Elliott Abramz) اور جارج شلز کو معلوم تھیں۔[47]

ایران۔ باغی مقدمے کی سماعت کے دوران ان کی لاعلمی اور لاپرواہی کسی تبصرے کی متقاضی نہیں ہے۔ ہمیں جارج شلز کی اس'' بے ساختگی اور کھرے پن پر شک کا اظہار نہیں کرنا چاہیے جو انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لئے کیا'' اور جس نے کانگریس اور ذرائع ابلاغ کو حد درجہ متاثر کیا۔[48] نکاراگوا میں امدادی جہاز گرائے جانے، بیروت کے جریدے اور ایرانیوں کی طرف سے قومی سلامتی کے مشیر میک فارلانس (Mc Farlance) کے دورہ تہران کا انکشاف ہونے کے بعد رازداری قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ مکروفریب سے بُنے گئے اس عالمی جال کی گرہیں جب اکتوبر 1986ء میں کھلنا شروع ہوئیں تو واشنگٹن میں موجود دہشت گردوں کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ انہیں مجبوراً یہ بہانہ بنانا پڑا کہ انہیں اس پروگرام کی تفصیل کے متعلق کوئی آگاہی نہیں ہے۔ ان انکشافات نے، اگرچہ وقتی طور پر ان کی دہشت گردی کی صلاحیتوں پر کاری ضرب لگائی۔ ان انکشافات نے ایماندار صحافیوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ حقائق کو شائع کر سکیں اس سے پہلے کہ تمام دروازے دوبارہ مقفل کر دیئے جائیں۔

باب 4

سکینڈل کی حدود

سکینڈل کے اجزائے ترکیبی کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اہلِ علم کی رائے میں اصل سکینڈل ریگن انتظامیہ کا ایران جیسی دہشت گرد ریاست سے اسلحے کی فروخت کا سودا کرنا تھا۔ یہ سب کچھ ان وعدوں کے برخلاف تھا، جو انسانی تہذیب کو دہشت گردی کی لعنت سے پاک کرنے کیلئے کئے گئے تھے۔ جارج شلز نے دہشت گردی کو انسانیت کے دشمنوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی طاعون کی وبا قرار دیا۔ ان کے خیال میں دہشت گردی۔ دورِ ظلمت میں واپس لوٹنے کی طرف ایک قدم ہے۔ جارج مِک گورن(George McGovern) نے، جو مخالف رائے کی نمائندگی کر رہے تھے، سکینڈل کو ''تضحیک آمیز'' قرار دیا۔ ایک ایسی انتظامیہ جس نے اقتدار میں آتے ہی یہ اعلان کیا تھا کہ دہشت گردی کا مقابلہ اس کی خارجہ پالیسی کا سب سے اہم جزو ہوگا، [1] ایسی حکومت (ایران) کو اسلحہ بیچتے ہوئے پائی گئی جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی دہشت گرد حکومت ہے۔ دوسرا سکینڈل یہ تھا کہ کانگریس کی ہدایات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے، ایک خفیہ حکومت قائم کی گئی تا کہ کانگریس کی باز پُرس سے بچا جا سکے۔

سکینڈلز کی اس چار دیواری کے اندر بہت سے سکینڈل موجود تھے۔ جمہوری عمل سے نفرت نے ہر دن ایک نئے انکشاف کو جنم دیا۔ یہ سب انکشافات ''قدامت پسندی'' کے اس دعویٰ کی قلعی کھولتے ہیں جسکے مطابق حکومت عوام اور منتخب نمائندوں کو جوابدہ ہوتی ہے۔ اولیونارتھ کی کارگزاریاں ان سفاک حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو ریاست میں ''قدامت پسندی'' کے نام پر کی گئیں۔ یہ

کارگزاریاں تشدد پر مبنی تھیں اور جمہوریت کیلئے خوف اور نفرت کا اظہار تھیں۔ ہم میں سے جو بھی ریگن دور حکومت کی پالیسیوں کا بغور جائزہ لے گا، اس پر یہ حقائق آشکار ہوتے چلے جائیں گے۔ نیویارک ٹائمز اور وال سٹریٹ جرنل نے ان پالیسیوں میں فسطائیت کی بو سونگھ لی تھی۔[2] اسلئے حکومتی عہدیداروں نے عوامی غم و غصے سے بچنے کے لئے خفیہ طور پر مجرموں کے ٹولے کی بنیاد رکھی۔ نارتھ کی طرف سے اسلحے کے دلال مونذر رایلکاسر (Monzer Alkassar) کو ڈیڑھ ملین ڈالر کی ادائیگی اب کوئی راز کی بات نہیں رہی۔ یہ وہی شخص تھا جسے برطانیہ نے ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا تھا اور جو ایف بی آئی اور ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے زیر تفتیش تھا۔[3] تاہم سکینڈل کی حدود کی جانچ پڑتال اور ان کا تعین ضروری امر ہے۔

کانگریس نے آغاز ہی سے اس نقطے کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ کہ وہ اتنا ہی علم حاصل کرے گی جو اس کے لئے ناخوشگوار نہ ہو۔ تحقیقات کا رخ بار بار سی آئی اے کی جانب مڑ رہا تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو حکومتی عہدیداروں کی خفیہ سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے یہ کوئی نئے انکشافات نہ تھے۔ باغیوں کے رہنماؤں کے مطابق وسطی امریکہ میں سی آئی اے کے چیف ایلن فائرز (Alan Fiers) ''باغیوں کو منظم کرنے کے ذمہ دار تھے'' ڈینس وولمین نے اپنی رپورٹ میں کانگریس اور تجزیہ نگاروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ بولینڈ ترمیم نے جب باغیوں کو اسلحے کی فراہمی کا راستہ روکا تو سی آئی اے کی انتظامیہ نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا، فائرز ہی وہ شخص تھا'' جس نے تمام کارروائیوں کی نگرانی کی۔ باغی دھڑوں کے ساتھ لین دین اس کی ذمہ داری تھی۔ اس سلسلے میں ہر قسم کی پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد اسکے فرائض منصبی میں شامل تھا۔'' ایف ڈی این (FDN) (باغیوں کی فوجی طاقت) کے رہنماؤں اور اڈیلفو کیلرو جیسے بیوپاریوں کے ساتھ اسکے دوستانہ مراسم تھے۔ ''کیلرو کے'' سی آئی اے کے ساتھ تعلقات تو سینڈینسٹا حکومت کے برسر اقتدار آنے سے پہلے کے تھے'' باغیوں کے ذرائع اشارہ کرتے ہیں کہ فائرز آرٹورو کرز کو۔ جو کہ امریکی سامعین کے لئے جمہوریت کی نشانی تھی، اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ کانگریس کی حمایت حاصل کی جاسکے۔ فائرز نے بروس کیمروں اور رابرٹ لیکن کے ذریعے اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی اصل منزل کیلرو، سوموزہ کی قیادت اور امراء کے طبقے کی حفاظت تھی، جو کہ ایف ڈی این کے روح رواں تھے۔ وہ امریکی ذرائع جو حالات کا بغور مشاہدہ کر رہے ہیں یہ بات جانتے ہیں کہ فائرز کا سعودی عرب میں بطور چیف کام کرنا کتنا سودمند ثابت ہوا۔ سعودی عرب باغیوں کے سب سے بڑے حامی کے طور پر سامنے آیا۔ باغی اور امریکی ذرائع دونوں

اس بات سے باخبر تھے کہ فائرز اور سی آئی اے کا اثر ورسوخ نارتھ سے کہیں زیادہ ہے۔ سی آئی اے کے ایک سابق عہدیدار ریلف مک گی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''تمام کمیٹیاں بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف حرکت کر رہی ہیں، کوئی بھی سی آئی اے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا نہیں چاہتا حالانکہ ہر موقعہ پر ایک نیا ثبوت چیخ چیخ کر سی آئی اے کا نام لیتا ہے۔'' وہ آگے چل کر کہتے ہیں ''خفیہ کارروائیوں کے اس جال کو نہ صرف سی آئی اے کی سرپرستی حاصل ہے بلکہ اتنا منظم کام سی آئی اے کی نگرانی کے بغیر ممکن ہی دکھائی نہیں دیتا۔''[4] فائرز اور سی آئی اے کے دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کے جب بیانات لئے گئے تو یہ ایک رسمی کارروائی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ لیکن سینٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کے چیئرمین ولیم کوہن اس بات پر قائل تھے کہ سی آئی اے کے دہشت گرد مخالف کارروائیوں کے چیف ڈیون کلیرتج دہشت گردی کو بھڑکانے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔[5]

اس بات کا ادراک میں آنا مشکل ہے کہ کس طرح سی آئی اے اور اس کے عہدیداروں نے نارتھ جیسے نااہل اور شیخی خور کو بے لگام چھوڑے رکھا۔ نارتھ کی یہ خصوصیات اس کے بیانات کے بعد مزید کھل کر سامنے آ گئیں۔ ہر وہ کارروائی جس میں نارتھ نے حصہ لینے کا دعویٰ کیا بالآخر تباہی و بربادی پر ختم ہوئی۔ ان میں وہ کارروائیاں بھی شامل تھیں جن کا ذکر نارتھ بڑے فخر سے کیا کرتا تھا۔[6] اس کی دروغ گوئی کی عادت قابلِ رحم حد تک پہنچ چکی تھی۔ ابوندال کی طرف سے دھمکیوں کی اشکوں بھری کہانی، جس نے اسے جنرل سیکورڈ کے تحائف قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جھوٹ کا پلندہ تھی، اس دھمکی کا کوئی ثبوت نہ تھا اور پینٹاگون کے ریکارڈ پر سیکورٹی مہیا کرنے کی ایسی کوئی درخواست موجود نہیں تھی۔[7] جہاں تک کانگریس کے ریکارڈ سے معلومات چوری ہونے کا تعلق ہے۔ تو نیوز ویک کے مطابق ایسا نارتھ ہی کی وجہ سے ہوا (Achille Lauro کے بارے میں) جبکہ سینٹر اینوئے (Inouye) کے مطابق لیبیا پر حملے کے سلسلے میں خفیہ معلومات حکومتی عہدیداروں کی وجہ سے چوری ہوئیں۔ اسکے علاوہ بہت سی ایسی کارروائیوں کا ذکر کیا گیا جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔[8] یہ سب باتیں یقیناً سی آئی اے کے ڈائریکٹر، کیسی (Casey) کے علم میں تھیں، جو نارتھ کے بقول اس کے قابل اعتماد ساتھیوں میں سے تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنی تحقیقات کا دائرہ محدود رکھا اور اپنے آپ کو غیر اہم معاملات میں الجھائے رکھا، کمیٹی کی اس نیت کا اندازہ آغاز ہی سے ہو گیا تھا جب تھامس پولگر کا بطور مفتش انتخاب کیا گیا۔ پولگر امریکہ کے سابق انٹیلی جنس افسروں کی ایسوسی ایشن کا ایک فعال رکن تھا۔ سی

آئی اے میں اس کی ملازمت کئی سالوں پر محیط تھی۔ اس دوران اس نے ویت نام میں بھی کافی عرصہ گزارا یہاں اس نے تھیوڈور شیکلی (Theodore Shackley) جیسی شخصیات کے ساتھ کام کیا۔ شیکلی ایران کو اسلحہ فروخت کرنے میں ملوث تھا۔ ذرائع ابلاغ پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میامی ہیرلڈ میں چھپنے والے پولگر کے وہ خیالات بھی کسی کو یاد نہ رہے۔ [9] جس میں انہوں نے یوجین حیسن فر اور سی آئی اے کے کردار کو سراہا تھا۔ کمیٹی نے سی آئی اے اور باغیوں کے درمیان منشیات کے تعلق کو بھی نظر انداز کر دیا۔ [10] ایران کو اسلحے کی فراہمی کے سلسلے میں معروف شخصیات، ایڈوں ولسن جیسے اسلحے کے سمگلر اور سی آئی اے کے سابق ایجنٹوں کے درمیان عرصہ دراز سے موجود تعلقات سے پردہ اٹھانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ باغیوں کو منظم کرنے میں ولسن کا ایک اہم کردار تھا اور وہ جنرل رچرڈ سیکورڈ اور ان کے مددگار سی آئی اے کے سابق عہدیدار تھامس کلاینز کا قریبی رفیق تھا، لیکن مفتشین اور استغاثہ نے اس کا بیان لینا ضروری نہیں سمجھا اور نہ ہی کمیٹی نے مشتبہ افراد اور ان کے خفیہ روابط اور کارروائیوں کو قابل اعتناء خیال کیا۔ [11] اسرائیل کے ساتھ روابط خطرناک حد تک بڑھ چکے تھے۔ مگر ان پر بھی پردہ ڈالا گیا۔ ایران کو اسلحے کی فروخت میں اسرائیل نے بنیادی کردار ادا کیا۔ مگر کانگریس اسے اچھالنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ سینٹر جان ٹاور نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''اگر آپ کا خیال ہے کہ کانگریس بھڑوں کے اس چھتے میں ہاتھ ڈالے گی، تو اس کیلئے آپ کو طویل عرصے تک انتظار کرنا ہوگا۔'' [12] کالم نگار ایونیز (Evans) اور نووک (Novak) کے مطابق سینٹر اینوئے نے اسرائیل سے بے شمار فنڈ حاصل کئے۔ سکینڈل کے منظر عام پر آنے کے بعد جب اینوئے نے اسرائیل کا دورہ کیا تو وزیر اعظم شمیر نے انہیں ''امریکہ میں اسرائیل کا عظیم ترین دوست قرار دیا'' انہوں نے ایرانی معاملات کو سکینڈل کی شکل دینے پر ذرائع ابلاغ کی مذمت کی جس سے ان کی قوم کی ساکھ اور سالمیت کو نقصان پہنچا ہے۔'' ہر چند کہ اسرائیلی روابط بہت پہلے سے واضح تھے لیکن وزیر اعظم شمیر نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ یہ انکشافات امریکہ، اسرائیل تعلقات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ [13]

مختصراً تحقیقاتی کمیٹیوں نے اپنی تحقیق کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کی اور بہت سے اہم سوالات پوچھے ہی نہیں گئے، ان میں سب سے اہم سوال یہی تھا کہ کیا صدر ریگن کے علم میں تھا کہ ان کا قبیلہ کیا کر رہا ہے؟ یا کیا صدر ریگن نے ان ساری کارروائیوں کی اجازت دی تھی؟ ان سوالات پر ریگن کے انکار کو عوام اور مبصرین کی اکثریت نے شک کی نظروں سے دیکھا ہے لیکن مجھے ریگن کی دعووں میں

سچائی نظر آتی ہے۔ یہ بہت حد تک ممکن ہے کہ صدر ریگن کو ان معاملات پر معلومات ہی فراہم نہ کی جاتی ہوں جن پر انہوں نے پریس کانفرنس میں اظہار خیال نہیں کرنا ہے۔ یہ انداز بھی تعلقاتِ عامہ کی صنعت کی پیداوار ہے۔ حقیقی دنیا میں اس معاملے کی اہمیت شاید بہت کم ہو لیکن تصورات کی دنیا میں اسکی اہمیت ہے جہاں نظریہ دانوں کو یہ بات ثابت کرنے کے لئے سخت محنت کرنا چاہیے کہ عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے اپنے رہنماؤں کے لئے پالیسی کے خدوخال وضع کرتے ہیں۔ سکینڈل کی حدود متعین کرتے ہوئے یہ تنگ نظری شدید گمراہ کن ہے کیونکہ یہ بہت سے اہم موضوعات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں ریاست نے اپنے قائم کردہ ایجنڈے میں جگہ نہیں دی اور جنہیں ذرائع ابلاغ نے قبول نہیں کیا ہے اس سے ہمیں دہشت گردی کے کلچر کے اندرونی رازوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آیئے ہم ان میں سے کچھ موضوعات پر بحث کرتے ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے دوران امریکہ نے وسطی امریکہ کی ''نوخیز جمہوریتوں'' کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک سکینڈل نہیں ہے آغاز ہی سے یہ واضح تھا کہ یہ سلوک کانگریس یا میڈیا کی طرف سے کسی انکوائری کا موضوع نہیں بنے گا بلکہ یہ کارہائے نمایاں ہماری روایتی مہربانیوں کا مظاہرہ تصور کی جائیں گی ہماری طرف سے طاقت کا استعمال ان مخصوص قدروں کے فروغ کیلئے تھا جنہیں ہم ''نہایت عزیز جانتے ہیں۔''[14]

امریکہ کا نکاراگوا پر غیر قانونی حملہ ''سکینڈل'' نہیں اور نہ ہی امریکہ کی بین الاقوامی دہشت گردی کا جزو ہے۔ جون 1986ء میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا ''امریکہ کی طرف سے طاقت کا استعمال غیر قانونی ہے۔'' اور بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی ہے۔ ''امریکہ نہ تو اپنے دفاع کے لئے اقدام کرنے میں حق بجانب ہے (امریکہ کا دعویٰ) اور نہ ہی امریکہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ نکاراگوا کی ایل سیلواڈور میں مداخلت کے خلاف کوئی تدابیر اختیار کرے کیونکہ بین الاقوامی قانون اس کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دیتا۔'' عدالت کو ایل سیلواڈور کے گوریلوں کے لئے نکاراگوا کی امداد سے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیے گئے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ اسلحے کے بہاؤ کو روکنے کے لئے نکاراگوا پر ہنڈرس، ایل سیلواڈور یا امریکہ سے بڑھ کر ذمہ داری عائد نہیں کی جا سکتی۔ عدالت نے اس کا ذکر بھی کیا کہ اگست 1984ء سے پہلے تک ایل سیلواڈور نے نکاراگوا پر مسلح حملے کا الزام نہیں لگایا تھا۔[15] عالمی عدالت کے فیصلوں کو باآسانی نظر انداز کر دیا گیا۔ امریکی سینٹ نے بین الاقوامی قانون کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت 100 ملین ڈالر کی فوجی امداد کو منظور کر کے دیا۔ ایسا

عدالت کے فیصلے سے صرف دو ہفتوں کے بعد کیا گیا، جس میں امریکہ سے کہا گیا تھا کہ وہ غیر قانونی طاقت کا استعمال بند کردے۔ ایوانِ زیریں میں جہاں ڈیموکریٹک پارٹی کی اکثریت تھی، دنیا کے نظام کو درپیش خطرات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سینٹ کے اقدام کی منظوری دے دی گئی۔

عالمی عدالت کی ''جارحیت'' اور ''مغرب کے خلاف اس کے روایتی تعصب''[16] کی مذمت کی گئی۔ اسی 'جارحانہ' عدالت نے 1980ء میں ایران کے خلاف امریکہ کے حق میں فیصلہ دیا تھا لیکن یہاں اسے غیر متعلقہ اور غیر اہم قرار دیا گیا۔ باغیوں کے حامی رابرٹ نے الزام لگایا کہ ''عدالت کے سوویت یونین کے ساتھ گہرے مراسم ہیں''[17] جب ہم اس حقیقت کا جائزہ لیں کہ سوویت جج نے پہلے ہی اپنے آپ کو مقدمے سے علیحدہ کر لیا تھا تو یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوتی ہے۔ لیکن دہشت گردی اور مارکس اِزم مخالف ماحول میں یہ ایک قدرتی امر ہے۔ بہت سے ذی شعور مبصرین بھی اس بات پر مُصر تھے کہ امریکہ کو عالمی عدالت کے فیصلے بالائے طاق رکھ دینے چاہیں کیونکہ ''آزادی کی حفاظت کیلئے آزاد فیصلے'' اشد ضروری ہیں، اس کے بعد امریکہ نے سکیورٹی کونسل کی اس قرارداد کو ویٹو کیا (11 ممبر قرارداد کے حق میں تھے۔ امریکہ نے اس کی مخالفت کی اور تین ممبر غیر حاضر رہے) جس میں تمام ممالک کو بین الاقوامی قانون کے احترام کے لئے کہا گیا تھا۔ اسکے علاوہ جنرل اسمبلی کی اس قرارداد کی بھی مخالفت کی گئی جس میں عالمی عدالت کے فیصلوں پر عملدرآمد کے لئے کہا گیا تھا۔[18] امریکہ کے علاوہ ایل سیلواڈور اور اسرائیل نے قرارداد کے خلاف ووٹ دیا۔ جنرل اسمبلی کی اس قرارداد کو اس دن نیو یارک ٹائمز میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ اقوام متحدہ میں اخبار کے نمائندے نے اس دن ادارے کے ملازمین کی بھاری تنخواہوں کی خبر کو زیادہ اہم خیال کیا۔ سکیورٹی کونسل کی کارروائی کو ایک مختصر سے نوٹ کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اس سے ایک دن پہلے جنرل اسمبلی کی اس قرارداد کے ساتھ بھی یہی حشر ہوا جس میں بحیرہ اوقیانوس کے جنوب کو ''امن کا خطہ'' قرار دینے کو کہا گیا تھا اور جو ایک کے مقابلے میں 124 ووٹوں سے منظور کر لی گئی تھی۔ یہاں بھی حسبِ معمول مخالفت کا ووٹ امریکہ کی طرف سے ڈالا گیا۔[19] عالمی عدالت کے فیصلے اور ان پر امریکہ کا اظہار نفرت سکینڈل کا حصہ نہیں ہے۔ اس معاملے میں کانگریس نے کسی قسم کی انکوائری کا فیصلہ نہیں کیا، یہ اقدام اور اس کیساتھ ساتھ GATT میں امریکی اقدامات کی مذمت اور بہت سے دوسرے غیر اہم واقعات بہت جلد یادوں سے محو ہو گئے، ان میں سے کوئی جارج شلز کی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچا سکا۔ جارج شلز پہلے ہی یہ اعلان کر چکے تھے۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے کیے

ہوئے تمام اقدامات قانون کے تابع ہوں گے۔''[20] جارج شلز شاید ٹھیک کہہ رہے تھے کیونکہ امریکہ کا کہا ہوا قانون بن جاتا ہے۔ دہشت گردی کے کلچر کا یہ ایک قدرتی اصول ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں ہم بڑی آسانی سے امریکی رہنماؤں کی سوچ کا ادراک کر سکتے ہیں۔ امریکہ ایک لاقانون اور جارحانہ ملک ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہے، مزید یہ کہ بین الاقوامی قانون، عالمی عدالت، اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی ادارے محض لغویات ہیں اور ان کے فیصلے امریکی پالیسی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے چاہیں۔ عالمی رائے عامہ واشنگٹن میں موجود دہشت گردوں کے پیش اماموں کا راستہ اسی وقت روک سکتی ہے۔ جب اس کی آواز میں مناسب جوش و جذبہ موجود ہو۔ اسی طرح ملکی رائے بھی بیکار ہے جب تک یہ نفرت اور احتجاج کے ایک خاص مقام تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک ہمارے نظریہ دان اپنی لفاظی کے ذریعے قانون کے احترام اور تعظیم کی کہانیاں سناتے رہیں گے۔ ''دنیا میں دوسرا کوئی ملک نہیں ہے جو قانون، اسکی حدود اور لچک کے بارے میں اتنی بات کرتا ہو۔''[21] جہاں تک ''بات'' کرنے کا تعلق ہے یہ بیان بالکل درست ہے۔ امریکی دہشت گردی اس صورت میں سکینڈل ہے اگر یہ طاقت ورلوگوں کے استحقاق سے انحراف کرتی ہے یا اشراف کو اس کی کوئی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ کانگریس مختلف حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے اس لئے کانگریس کی واضح ہدایات کی خلاف ورزی ایک سکینڈل ہے۔ واٹر گیٹ کے دور میں ڈیموکریٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں نقب زنی کے بارے میں تو بہت غم و غصے کا اظہار کیا گیا[22] لیکن نکسن انتظامیہ اور ان سے پہلے صدور کے ان جرائم پر پردہ ڈال دیا گیا جن کا انکشاف تقریباً اسی وقت ہوا تھا۔ ان انکشافات میں ایف بی آئی کے ہاتھوں سوشلسٹ ورکرز پارٹی کی تباہی بھی شامل ہے۔ 1960ء کی دہائی کے اوائل میں ایف بی آئی کی مدد سے پارٹی کے دفتر میں نقب زنی کے کئی واقعات ہوئے۔ اس کے علاوہ شہری علاقوں میں ایف بی آئی کی جارحانہ کارروائیاں، شہری حقوق کی تحریک کو دبانا اور اس طرح کے بیسیوں واقعات تھے جن پر پردہ ڈال دیا گیا۔ ڈیموکریٹ پارٹی امریکی شہریوں کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ سوشلسٹ ورکرز پارٹی۔ جو کہ ایک قانونی سیاسی جماعت ہے۔ شہریوں کی نمائندگی نہیں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریٹ پارٹی کے دفتر میں ایک معمولی سی نقب زنی اور سوشلسٹ پارٹی کے دفاتر میں ایسی کئی وارداتوں میں اتنا بڑا فرق کیوں تھا۔ ''نکسن کے دشمنوں کی فہرست'' ایک سکینڈل تھا لیکن ایف بی آئی کی مدد سے شکاگو پولیس کا فریڈ ہیمپٹن کو قتل کرنا سکینڈل نہیں تھا۔ نجی محفلوں میں حکمرانوں کو گالیاں دینا سکینڈل تھا، لیکن بلیک پینتھر کے ناظم کا قتل سکینڈل نہیں تھا۔